جلد ۱۰۰ جنوری ۱۹۸۴ء عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ تعالیٰ

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

سفینۂ نجات

از

مولانا جلیل احسن ندوی

کا نیا ایڈیشن

طبع ہو کر آگیا ہے تاجران کتب
اور قارئینِ کرام اپنی مطلوبہ تعداد
کے لیے پہلی فرصت میں اپنے
آرڈر سے مطلع فرمائیں۔

سائز $\frac{۲۳ \times ۱۸}{۸}$ خوبصورت کور

قیمت : ۲۸/۵۰ روپے

مولانا مودودی کے سیاسی افکار

از

عبدالکریم عابد

کا نیا ایڈیشن

طبع ہو کر آگیا ہے تاجران کتب
اور قارئینِ کرام اپنی مطلوبہ تعداد
کے لیے پہلی فرصت میں اپنے
آرڈر سے مطلع فرمائیں۔

سائز $\frac{۲۳ \times ۱۸}{۸}$ خوبصورت کور

قیمت : ۲۴/- روپے

اِدارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ - لاہور

رحمان مارکیٹ - غزنی سٹریٹ - اُردو بازار

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۰۰	جنوری ۱۹۸۴ء مطابق ربیع الثانی ۱۴۰۴ھ	عدد ۵

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون نمبر ———— ۴۱۰۳۱۶

زرسالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایم فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ہماری بڑی مشکل یہ ہے کہ قوم کے سیاسی بزرگ زیادہ زور اس پہ دے رہے ہیں کہ "انتخابات جلد ہونے چاہئیں" —— اور ان کا کہنا غلط بھی نہیں ہے۔ دوسری طرف صاحبِ اقتدار قوت ہے وہ کہتی ہے کہ "انتخابات سے مثبت نتائج حاصل ہونے چاہئیں"۔ بات یہ بھی درست ہے۔ مگر ایک عرصہ کی بیان بازی اور رد و کد کے باوجود دونوں طاقتیں معمولی فاصلے پر کھڑی ہونے کے باوصف اپنے اپنے قدم ذرا سے آگے بڑھا کر ایک خطِ اتحاد پہ جمع نہیں ہو سکیں۔

فوجی قوت جب بھی آتی ہے تو وہ اصلاح و تعمیر کے اعلان کے ساتھ آتی ہے، مگر اصلاح و تعمیر کا ٹائم ٹیبل بڑھتا جاتا ہے۔ منزل مسافر کے آگے آگے دوڑتی رہتی ہے اور اصلاح و تعمیر کا ہونا تو کجا اُلٹے صدہا اُلجھنیں ایسی پیدا ہو جاتی ہیں کہ ایک دن آتا ہے، جب فوجی قوت بے تاب ہو جاتی ہے کہ جلد سے جلد الوداعی سلیوٹ کرے، مگر امن امان اور عزت آبرو سے سلیوٹ کرنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ اب آہستہ آہستہ وہ لمحہ قریب ہو رہا ہے جب "مسکرا کر سلیوٹ کرنا" مشکل ہو جائے گا۔ اس سے پہلے جو تھوڑی سی مہلت ہے اس میں سیاست کے بند دروازوں کو کھولنے اور سیاسی عناصر کو مطمئن کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ یہ نقطۂ نظر بھی مثبت نظر رکھنے والے تعمیر پسند سیاست دانوں اور اُن کے ہم نوا جمہور کا ہے۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو نہ فوج سے عناد رکھتے ہیں اور نہ جمہور کی پریشانی سے آنکھیں بند کر سکتے ہیں۔

مگر مشکل یہ ہے کہ اُدھر والے حضرات سیاسی دلچسپیاں رکھنے والوں کا بہترین خیر خواہانہ اشارہ بھی تو نہیں مانتے۔ جیسے انہیں اپنے سوا اور کسی پر اعتماد ہی نہ ہو، حتیٰ کہ عالمی تاریخ تو کیا، خود پاکستان میں مارشل لا اور جمہوریت کے تصادم کے گذشتہ احوال و نتائج پر بھی بھروسہ نہیں ہے۔ جیسے ان کے اپنے خیال و تاثرات کے سوا سب کچھ خود غرضانہ جھوٹ نہیں تو کم سے کم بزدلانہ وہم ضرور ہو۔ ان کا سرمایۂ اعتماد ۲۱، ۲۲ گریڈ کے سیکرٹریوں اور اُن کی فائلوں سے بھری الماریاں، سی آئی ڈی کی رپورٹیں اور فوجی کونسل کے شرکاء کا تذبذب ہے اور فی الحقیقت یہی وہ قوت ہے کہ جو مارشل لا کے کسی اچھے پروگرام کو بھی نہیں چلنے دیتی۔ اب تک جو مارشل لا آئے وہ سیاست دانوں کو سب سے بڑا خطرہ سمجھتے رہے۔ فوج کی آہنی قوت بھی بیورو کریسی کو اپنا محسن ہی سمجھتی رہی۔

دوسری طرف یہ مصیبت بھی کچھ کم قابلِ توجہ نہیں کہ جمہوریت جب بھی بحال ہوتی ہے اور پارلیمانی نظام کام کرنے لگتا ہے تو شر و فساد کے اور بھی دروازے کھل جاتے ہیں۔ اہلِ سیاست میں ایک تو بندگانِ مفاد گھسے ہوتے ہیں، دوسرے اصول و کردار کا فاقہ ہے۔ نتیجہ یہ کہ اتحاد نہیں ہوتا۔ ہوتا ہے تو کسی اعلیٰ نصب العین اور اُصول کے لیے نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے وہ جب ٹوٹتا ہے تو جادہ حیات کے راہ گیروں کے پاؤں کو چھیدنے والی مسائل کی کرچیاں ہر طرف پھیل جاتی ہیں۔

آج کئی چھوٹے چھوٹے گروہ اپنا اپنا جھنڈا اُٹھائے موجود ہیں۔ مگر ایک دوسرے سے الگ تھلگ۔ ان کے پاس یا تو اعلیٰ نظریات و مقاصد نہیں اور یا صلاحیتِ ربط و ائتلاف نہیں، کہ یہ برسوں سے بکھرے پڑے ہیں ـــــ ذرا غور کریں، کس میں کتنا شعور ہے، کتنا نظم ہے، کتنا کردار ہے، کتنی خدمات ہیں۔ اور پھر کتنی رواداری ہے؟ یہ خوبیاں نہ ہوں تو اتحاد کیسے عمل میں آئے گا۔ انتخابات کیا گُل کھلائیں گے اور جمہوریت کیا رنگ دکھلائے گی۔

دراصل ہمارے یہاں جمہوریت کا کوئی ایسا معیاری دَور کبھی قائم ہی نہیں ہوا جسے سامنے رکھ کر ہم سوچیں کہ وہاں تک ہمیں جانا ہے۔ "آخر شب" جب "بسمل کی تڑپ" دید کے قابل ہوئی، اُس وقت بھی ہمیں ایک ایسی جمہوریت نصیب ہوئی جس کے انڈوں کے سینے کا کام

مارشل لاء کی قوت ہی نے کیا تھا۔ اور پھر اس جمہوریت کے جوڑوں نے "انسانیت" کو وہ ننگا ناچ نچایا کہ خلقِ خدا ترا ہ ترا ہ کر اُٹھی۔ نوبت بایں جا رسید کہ جمہوریت کے ملبوس میں اس فسطائیت نے لوگوں کو سرے سے جمہوریت کے نام ہی سے بیزار کر دیا۔ اور لوگ یوں سوچنے لگے کہ ——— یوہا لنڈورا ہی بھلا!

ہماری گذارش تو یہی ہے کہ ہمارے اکابر انتخابات کرائیں، جلد کرائیں اور صلح سلامتی کی فضا میں کرائیں تاکہ نظام کے تسلسل کو برقرار رکھا جاسکے۔ اور دو قوتیں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے تکدر کا راستہ اختیار نہ کرلیں۔

بہر حال دیر کیجیے یا سویر، فضا کو ٹھنڈا رکھیے یا لوگوں کو گرما گرمی پیدا کرنے کا موقع دیجیے، محبت و آشتی کی فضا میں محفل آرائی کیجیے یا حرف و صوت میں تیزی پیدا کیجیے، انتخابات کا انعقاد تو اب لازمی ہے۔ بیچ سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں اور نہ زیادہ ٹال مٹول کا موقع باقی ہے، کیونکہ تاخیر و التوا کی ہر وجہ رہے سہے اعتماد کو ختم کر دے گی۔ اب تو تقاضائے مصلحت یہ ہے کہ مستقبل کے وعدہ و اعلان کو گھسیٹ کر پیچھے لایا جائے۔ گردشِ ایام کو تھوڑا سا پیچھے دوڑا لینے میں کوئی ہرج نہیں۔

کاش کہ ایسا ہوتا کہ جہاں کچھ باتیں ڈھانچے اور وعدے کی شکل میں تھیں، وہاں کوئی نہ کوئی اقدام نقدا نقد بھی لوگوں کی توقع سے پہلے کر دیا جاتا۔ مثلاً اس اعلان سے کوئی بڑا فرق واقع نہ ہوتا کہ آج سے پارٹیاں بحال کی جاتی ہیں اور وہ فی الحال بند کمروں کی پابندی کے ساتھ اپنے تنظیمی، مشاورتی اور انتخابی وظائف انجام دے سکتی ہیں۔ اگر بروقت یہ واقعہ رونما ہو جاتا تو نہ صرف اس کا نشہ لوگوں میں اچھا خاصا کام کرتا، بلکہ آئندہ کے لیے ان کی قوتِ اُمید و اعتماد مضبوط ہو جاتی۔ یا یہ فیصلہ سنا دیا جاتا کہ ۱۹۸۴ء میں ہم سارے انتخابات نمٹا دیں گے۔

کیا ہی اچھا موقع تھا کہ ربیع الاول کا مہینہ آیا تھا، اس کی ۱۲ رکو خاص پیغام میں

صدر صاحب کوئی نئی بات نوم سے کہتے جس سے عوام کا اعتماد بحال ہو جاتا۔

اب فوجی اور سیاسی دونوں قوتیں اس حقیقت پر غور کریں کہ جمہوریت اور انتخابات کو چلانے میں جس کم سے کم درجے کا معاشرہ کامیاب ہوسکتا ہے، آج شاید ہم اصلاحی و تعمیری مقاصد کے لحاظ سے حالات کو اس سے بھی زیادہ مشکل پائیں۔

اخلاقی تخریب کا زہر ہماری رگوں میں سرایت کر گیا ہے۔ ہم میں اپنی پہچان اور شناخت کم ہوتی جا رہی ہے۔ پاکستان کا مفہوم نگاہوں سے اوجھل ہو رہا ہے اور اقبال کے اشعار قوالوں کے حوالے ہو گئے ہیں۔ دفتر بہ دفتر اور محکمہ بہ محکمہ رشوت، سفارش کام کر رہی ہے، چیزوں میں ملاوٹ ہے۔ گلیوں اور سڑکوں بلکہ گھروں میں گندگی پھیلی ملتی ہے۔ انکم ٹیکس، کسٹم، ریلوے، پولیس، تعلیم گاہیں، امتحانی مراکز، بلدیاتی کونسلیں، کارپوریشنیں، احاطہ ہائے عدالت، جیل خانے، مخلوط مجالسِ تفریح، اخلاق بگاڑ کھیل تماشے، ـــــ آپ جدھر جائیں بگاڑ کا ایک طوفان اُمڈ رہا ہے۔ گنتی کے لوگ ان دائروں میں امانت و دیانت کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ مگر وہ بھی بگڑے ہوئے ساتھیوں اور ماتحتوں کو تلقینِ اصلاح کرنے کے بجائے اُلٹا اپنے وجود کے عاجزانہ (PASSIVE) تحفظ میں عمریں گزار دیتے ہیں۔ اور پھر اگر کوئی فیصلہ کن لمحہ تصادم آ جاتا ہے تو سرے سے استعفیٰ دے کر خانہ نشین ہو جاتے ہیں۔

ایسے معاشرے سے آپ کو دین سے محبت، ملک کی تعمیر اور عوام کی خدمت کو اُصول بنانے والی قوت برآمد کرنی ہے۔ کوئی ایسا طریقہ سوچنا ہے کہ اس معاشرے کے ووٹوں سے آپ اُس قلیل التعداد عنصر کو حاصل کر لیں جو ایمان و شرافت بھی رکھتا ہے، بصیرت و لیاقت بھی، اور سرگرمئ عمل بھی۔

آئندہ انتخابات کے سلسلے میں چند اُصولی باتیں ہو جائیں تو اچھا ہے۔

انتخابات پُر تکدر فضا پیدا ہونے سے پہلے ہونے چاہئیں، لہٰذا ان کے پہلے دور کے لیے مارچ ۱۹۸۳ء

ہو گا اچھا تھا ورنہ دو ایک ماہ اور التوا ہو سکتا ہے۔

تاخیر سے بے اعتمادی بڑھے گی، بے اعتمادی کو بارود بنا کر تخریبی قوتیں استعمال کریں گی۔ پاکستان کے مفاد میں ان قوتوں کو پچھلے طور طریقوں سے روکنا پڑے گا، نتیجہ کشمکش۔ اور پھر اگر کوئی بات ہو گی تو پُرتکدر فضا میں ہو گی۔ پُرتکدر فضا میں کسی کا بھی ذہنی توازن بجا نہیں رہتا۔ ہر کوئی انتہا پسند بن جاتا ہے، ہر کسی کی سعی ہوتی ہے کہ وہ پہلے بڑھ کر بلا مارے۔ اس مرحلے میں حکمران اور عوام (اور ان کے جو بھی لیڈر میدان میں ہوں) ایک دوسرے کے حریف بن کر بحران کا حل سوچتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم ایک نئے بحران میں داخل ہو جاتی ہے۔ انتخابات کے لیے صاف ستھری فضا اور ہنستے مسکراتے چہروں کی ضرورت یوں بھی ہے کہ پچھلے دور اور آئندہ دور میں کوئی صورت تسلسل پیدا کرنی ہے۔ یہ ضرورت شہریوں، سیاسی جماعتوں اور ان کے لیڈروں کی بھی ہے، اور یہ ضرورت سب سے بڑھ کر خود فوجی حکمرانوں کی بھی ہے۔

پھر اگر یہ بات سمجھ میں آجائے کہ صرف انتخابات کا انعقاد ہی مطلوب نہیں، بلکہ اچھی مصالحت پسندانہ اور صحت مندانہ فضا بھی ان کے انعقاد کے لیے ضروری ہے تو پھر طریق کار یہ نہیں چل سکتا کہ ایوانِ اقتدار جو بھی فیصلہ مناسب سمجھے گا کر دے گا۔ دوسرے فریق یعنی عوام اور اُن کی رہنمائی کرنے والے اہل سیاست سے ہم آہنگی لازمی ہو گی۔

اس وقت اہلِ سیاست کا زور اس بات پر ہے کہ انتخابات جلد ہونے چاہئیں۔ اور خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ ملک کی زیادہ مؤثر قوتوں کا متحدہ مطالبہ یہی ہے۔ یہ مطالبہ جلد پورا کرنے کا حتمی اور یقینی اعلان ہو جائے اور اس کے لیے مشینری بن جائے تو وہ تمام ہنگامے ختم ہو جاتے ہیں جو بحالیِ جمہوریت اور انعقادِ انتخابات کے لیے بعض عناصر نے برپا کیے، نیز وہ ہنگامے بھی ختم ہو جاتے ہیں جو سطح سمندر سے بہت نیچے پرورش پا رہے ہیں اور کچھ اور وقت اگر تاخیر و التوا میں گذار گیا تو وہ بھی سفینۂ ملت کے گرد رقصندہ ہو سکتے ہیں۔

ایک اور اُصولی بات یہ ہے کہ انتخابات لازماً جداگانہ بنیادوں پر ہونے ہیں جن کا نہایت

مفید تجربہ ہو چکا ہے۔ اقلیتوں کی سیٹیں بھی محفوظ، اور کوئی اکثریتی نمائندہ بھی کسی اقلیت کے مخصوص مطالبوں (اور خصوصاً خلاف اسلام رجحانات) کے دباؤ میں پسنے سے سلامت۔

لیکن قادیانیوں کے متعلق روش اب تک اُلجھی ہوئی ہے۔ اُن کے ملازمین، ان کے افسروں (اور مختلف گریڈوں اور کلیدی عہدوں پر فائز اشخاص) کا سروے مکمل طور پر ہونا چاہیے تاکہ معلوم ہو کہ یہ لوگ کس تناسب سے ہم پر مسلط ہیں۔ سول آبادی میں بھی اِن کی فہرست دوٹراں الگ بننی چاہیے، بلکہ دوسری اقلیتوں کے ساتھ جو "قادیانی ووٹر" مسلمان کے نام سے ووٹ ڈالنے آئے، پولنگ ایجنٹوں کا کام ہے کہ وہ پہلے سے ایسے قادیانیوں پر گرفت کرنے کے لیے تیار رہیں اور ضروری ثبوت مہیا رکھیں۔ علی الخصوص اُمیدواروں کے لیے اگر کوئی درخواست اس گروہ کی طرف سے مسلم نشست کے لیے سامنے آئے تو جانچ پڑتال کے وقت پورے ثبوت اور شہادتوں سے اس کو ناجائز ثابت کیا جائے۔

تیسری گذارش یہ کہ کالعدم جماعتوں کی اکثریت نے بھی اور اخبارات میں لکھنے اور اسٹیجوں سے بولنے والے دوسرے دانشوروں اور قومی اُمور پر کلام کرنے والوں نے بھی زیادہ تر اس امر پہ زور دیا ہے کہ انتخابات جماعتی بنیادوں پر ہونے چاہئیں۔

ترجمان القرآن ہی میں چند ہی ماہ پہلے میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں کہ "سیاسی جماعتوں" کی ضرورت و اہمیت کیا ہے۔ مگر یہ کوئی ضروری نہیں کہ میرے لکھے کو ہر کوئی پڑھے اور نہ یہ ضروری ہے کہ وہ لوگ پڑھیں جن کو کارپرداز کہتے ہیں، پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ اگر عالم بالا کے حضرات پڑھیں بھی تو کبھی غور کریں اور کسی چیز کو پُرافادیت پائیں تو اس کا اعتراف کریں اور جب عملی نقشہ بنانے لگیں تو کسی مفید بات کو پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت بھی انہیں محسوس ہو۔

میں ایک بار پھر یہ بات دوہرانا چاہتا ہوں کہ سیاسی جماعتیں کن کن صورتوں میں معاشرے اور اُس کی حکومت اور انتخابی و پارلیمانی سرگرمیوں کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہیں:

۱ ـــ سیاسی جماعتوں میں سے ہر ایک اپنے گرد بہت سے ایسے افراد کو جمع کرتی ہے جو ایک طرزِ فکر پر متحد ہو جائیں اور فرد فرد اپنی اپنی الگ سوچ بچار میں سرمست نہیں رہتا۔

۲ ـــ عوام کی سیاسی جماعتیں منظم رہنا اور منظم ہو کر کام کرنا سکھاتی ہیں اور چند سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کا کسی معاملے میں اطمینان تمام جمہور کو مطمئن کر دیتا ہے اور ان کا اضطراب سب کو مضطرب کرنے کا باعث بنتا ہے۔

۳ ـــ سیاسی جماعتیں اپنے پیروکاروں کو ملکی مسائل سے آگاہ کرتی ہیں، اُن کو احساس دلاتی ہیں کہ ہماری داخلی اور خارجی ضروریات کیا ہیں، ان کو ایک منشور پر جمع کرتی ہیں۔ اُن کو پورے ملک کی محبت کی تعلیم دیتی ہیں۔ اُن کو اسلامی دین و تہذیب اور اس کی قدروں کا شعور دلاتی ہیں، اُن کو اُن کی تاریخ سے آگاہ کرتی ہیں، اُن کے سامنے ان کے اکابر و اعاظم کی زندگیوں کو نمایاں کرتی ہیں اور مختلف طریقوں سے اُن کی تربیت کرتی ہیں۔

۴ ـــ سیاسی جماعتیں جس طرح کسی ناخوشگوار صورتِ حالات میں عوام میں گرماگرمی کی کیفیت پیدا کر سکتی ہیں، اسی طرح وہ اُن کو کسی مقصد کے لیے قربانی دینے اور کسی زیادتی پر صبر کرنے پر بھی تیار کرتی ہیں۔

۵ ـــ سیاسی جماعتیں ہی برادریوں، علاقوں اور زبانوں کی عصبیتوں سے بالاتر ہو کر عوام کو مُلک و ملت کے لیے کام کرنے کا راستہ دکھاتی ہیں۔ سیاسی جماعتیں نہ ہوں تو پھر عصبیتوں کی بنا پر تفرقہ پردازیاں وجود میں آتی ہیں۔

۶ ـــ سیاسی جماعتیں اس امر کا ذریعہ ہوتی ہیں کہ عوام اپنی شکایات اور مطالبات بلاکسی رکاوٹ کے اُن کے سامنے لائیں، اور پھر ان جماعتوں کے لیڈروں کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ہر مصدقہ اور قابلِ اعتماد شکایت کے ازالے یا ضرورت کی تکمیل کے لیے پارلیمانی ایوانوں یا وزارتی دفتروں یا دیگر اداروں تک بات پہنچائیں۔

۷ ـــ یہ کام بھی سیاسی جماعتیں ہی کر سکتی ہیں کہ حکومت جو صحیح پالیسی طے کرے یا مفید قانون بنائے اسے سیاسی کارکن گلی گلی، اپنے اپنے حلقۂ اثر میں واضح کریں اور اس کی ضرورت اور افادیت سے لوگوں کو آگاہ کریں۔ بلکہ یوں بھی ہوتا ہے کہ جو اقدام ہونے والا (باقی بر صفحہ ۴۸)

حکمتِ سیدمودودیؒ

قرآن اور مسلمان

اقتباس کردہ:- اختر حجازی صاحب

قرآن کی تعلیم اپنے پیروؤں میں حمایتِ حق کی ایسی ناقابلِ تسخیر رُوح پیدا کرنا چاہتی ہے جس سے اُن کے اندر کسی حال میں بدی و شرارت کے آگے سر جھکانے اور ظلم و طُغیان کے تسلط کو قبول کرنے کی کمزوری پیدا نہ ہونے پائے۔ قرآنی تعلیم کے مطابق انسان کی سب سے بڑی ذلت یہ ہے کہ وہ اپنے عیش و آرام یا مال و دولت یا اہل و عیال کی محبت میں مبتلا ہو کر حفاظتِ حق کی سختیوں سے ڈرنے لگے اور باطل کو طاقتور دیکھ کر اس کی غلامی قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ یہ ضعف جو درحقیقت جسم و جان کا ضعف نہیں بلکہ قلب و ایمان کا ضعف ہے، جب کسی قوم میں پیدا ہو جاتا ہے تو اس کے اندر سے عزّت و شرافت کے تمام احساسات خود بخود دُور ہو جاتے ہیں۔ اور اعلائے کلمہ حق کی اعلیٰ خدمت کو انجام دینا تو درکنار وہ خود اپنے آپ کو بھی حق کے راستہ پر قائم رکھنے میں کامیاب نہیں رہ سکتی۔ جسم کی غلامی کو لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کی بندشیں صرف اُوپر ہی اُوپر رہتی ہیں اور قلب و رُوح تک اُن کا اثر نہیں پہنچتا مگر حقیقت یہ ہے کہ جسم کے غلام ہونے سے پہلے رُوح غلام ہو چکتی ہے اور جسم غلامی کا غیرت شکن و ذلت انگیز لباس پہنتا ہی اُس وقت ہے جب رُوح غیرت و حمیّت کے جوہر سے عاری ہو جاتی ہے اور عزّت و شرافت کا احساس اس سے رُخصت ہو چکا ہوتا ہے۔ پس جو قوم اپنی کمزوری و بزدلی کے باعث اپنے حقوق کے تحفظ میں کوتاہی برتتی ہے اور شرارت کو طاقتور دیکھ کر اس کی اطاعت

پر آمادہ ہو جاتی ہے، اس میں یہ قوت کبھی باقی نہیں رہتی اور رہ نہیں سکتی کہ اپنے شعائر، اپنے آداب، اپنے قوانین اور اپنے دینی و اخلاقی اصولوں پر سختی سے قائم رہے اور اپنے اجتماعی نظام کو ٹوٹنے نہ دے۔ پھر جب کہ حق اور باطل دونوں باہم ضد ہیں اور ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے، تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک قوم باطل کی غلامی قبول کرنے کے بعد بھی حق کی بندگی پر قائم رہے، اور ایک سے عبدیت کا رشتہ جوڑ کر دوسرے کے رشتۂ عبدیت کو ٹوٹنے سے محفوظ رکھے۔ حق کی فطرت تو یکتائی پسند ہے، وہ باطل کو اپنا سہیم و شریک بنا کر کبھی ایسی تقسیم نہیں کر سکتا کہ آدھا میرا ہے اور آدھا تیرا ۔ اس لیے جس کسی کو اس کی بندگی کرنی ہو اُسے باطل کی بندگی چھوڑنی پڑے گی، اور اپنی گردن کو دوسری تمام بندگیوں کے طوق و زنجیر سے خالی رکھنا ہوگا۔

قرآن درحقیقت صحیفۂ فطرت ہے، فطرت کے اِس راز کو پوری طرح ملحوظ رکھتا ہے، اسی بنا پر انسان کو صرف دو راہیں بتائی گئی ہیں۔ یا موت، یا شرف۔ زندگی بے شرف کی تیسری راہ اس نے نہیں بتائی۔ (الجہاد فی الاسلام)

" مولانا مودودیؒ کی شگفتہ مزاجی" کے مؤلف نے اطلاع دی ہے کہ ان کی کتاب (ص ۸، سطر ۳) میں مولاناؒ کی والدہ محترمہ کا نام غلطی سے رقیہ بیگم کے بجائے حمیدہ بیگم لکھا گیا ہے۔ قاریان کرام کتاب میں درستی کر لیں۔

شہداء فی سبیل اللہ کا مرتبہ

جناب مفتی سیاح الدین صاحب کاکاخیل

مضمون کا یہ حصہ آخری قسط کی اشاعت کے بعد موصول ہوا۔ اِس تکمیلی حصہ مضمون کو بعد میں دیا جا رہا ہے۔ ربطِ مضمون کے لیے پچھلی قسط کی ۳،۲ سطور سامنے دی جا رہی ہیں۔ (ادارہ)

مومن آخرت کی زندگی کو حقیقی زندگی سمجھ کر دُنیا کی اِس چند روزہ زندگی اور اس کی نعمتوں پر اُسے ترجیح دیتا ہے، لیکن جو اس دُنیا سے محبت کرے، یہاں کی چند روزہ زندگی پر ریجھ جائے، وہ عاقبت سے بے پروا ہو کر اسی زندگی کو سب کچھ سمجھے اور یہاں کی محدود نعمتوں پر قناعت کرے اور دُنیا مطلوب و مقصود ہو تو یہ مومنانہ نظریہ نہیں۔ تو پھر وہ اللہ کی راہ میں لڑے گا نہیں موت کو ناپسند کرے گا۔ موت سے ڈرے گا اور جو موت سے ڈرتا ہے اُس کے پاس موت بہت دلیرانہ آتی ہے۔ جب ذہن کی یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو لازماً دشمن غالب آئیں گے۔ اور دیکھا جا رہا ہے کہ کروڑوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود اسی ذہن کی وجہ سے آج مسلمان کہلانے والے ہر ملک میں ذلیل و خوار اور مغلوب و مقہور ہیں۔ برائے نام آزاد حکومتوں میں بھی وہ حقیقتاً دوسروں کے غلام ہیں۔ سیاسی غلام ہیں، اقتصادی غلام ہیں، معاشرتی غلام ہیں، ذہنی غلام ہیں۔ اُن کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں سیاست اور نظام سیاست غیر اسلامی ہے، دوسروں سے درآمد کردہ۔

اُن کے اقتصادیات پر دوسروں نے پنجے گاڑے ہیں۔ تعلیم، ثقافت اور معاشرت اور ذہنی سوچ میں یورپ و امریکہ کے دریوزہ گر اور ان کے اندھے بہرے مقلد ہیں الغرض فضائل و مناقب والی شہادت کا جذبہ جب ختم ہوا اور موت ناپسندیدہ نظر آنے لگی تو دُنیا بھی تباہ ہو گئی۔ شہادت فی سبیل اللہ کی تو یہی فضیلت ہے کہ اس سے مرنے والے کی آخرت سنور جاتی ہے جس آخرت سے اُس کو محبت ہوتی ہے اُس میں وہ کامیاب زندگی حاصل کرتا ہے اور اس کے بعد دُنیا میں زندہ رہنے والے اس قوم کے افراد یہاں فتح و نُصرت سے متمتع ہو جاتے ہیں اور پوری قوم کی یہ زندگی عزّت و جلال کی ہو جاتی ہے۔

اس موقع پر مجھے اقبالؒ کا ایک شعر یاد آیا۔ اقبال کہتا ہے کہ کرمِ کتابی اور پروانے کا مکالمہ ہوا۔ کرمِ کتابی نے کہا کہ میں علم و حکمت کی کتابیں چاٹتا رہتا ہوں اور وہاں سے حکیمانہ نکتے اور زندگی کے راز حاصل کرتا ہوں۔ اس پر پروانے نے اُسے کہا کہ صرف کتابوں سے زندگی کے راز معلوم نہیں ہوسکتے۔ موت کے عاشق بننے اور ایک روشن شمع پر اپنی جان نچھاور کرنے سے اصل زندگی کی حقیقت معلوم ہوسکتی ہے۔ اور زندگی کو بال و پر مل جاتے ہیں۔

سہ تپش می کند زندہ تر زندگی را
تپش می دہد بال و پر زندگی را

اس سلسلہ میں ایک نہایت ہی اہم بات کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری ہے۔ آپ نے آیات میں، احادیث میں بار بار دیکھا کہ قتال کے ساتھ فی سبیل اللہ کی قید لگی ہوئی ہے۔ شہید کے ساتھ فی سبیل اللہ کی شرط لگی ہوئی ہے۔ اس لیے یہ سارے فضائل و مناقب اس مقتول کے لیے ہیں جس کو اللہ کی راہ میں، اعلاءِ کلمۃ اللہ کی جدوجہد میں اقامتِ دین کے لیے کوششیں کرتے ہوئے قتل کیا گیا ہو۔ وہ قتال اللہ تعالیٰ ہی کے لیے کر رہا تھا۔ اس کی نیت اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اور اس کی رضا کی تحصیل کی خاطر لڑنے اور جان دینے کی تھی۔ انما الاعمال بالنیات وانما لکل امرء ما نوی۔ یہ ایک ایسا کلیہ ہے کہ تمام اعمالِ صالحہ کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔ قتال بھی ایک عمل ہے۔ لیکن اس لڑنے مارنے میں مختلف طرح کی نیتیں ہوسکتی ہیں۔ کوئی شخص اس لیے بھی لڑتا ہے کہ مال و دولت حاصل کر وں۔ کوئی اس لیے

لڑتا ہے کہ میری بہادری، جرأت و جسارت کی شہرت ہو، ناموری ہو۔ کوئی اس لیے لڑتا ہے کہ قومی اور ملکی لڑائی ہے، محض قوم و ملک ہی کی خاطر اس میں شریک ہوتا ہے۔ کوئی اُجرت لے کر محض اس اُجرت ہی کے پیش نظر جنگ میں حصّہ لیتا ہے یہی اُس کی غرض ہے۔ اور کوئی خالص رضائے الٰہی اور اقامتِ دین کے لیے میدان میں نکلتا اور دوسروں کو مارتا اور خود جان دیتا ہے۔ تو شرعاً اور حقیقتاً شہید وہ ہے جو اس آخری نیت کے ساتھ یہ سارا کام کر رہا ہے۔ ایک صحیح حدیث میں یہ مضمون موجود ہے۔ بخاری شریف اور مسلم شریف میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے یہ روایت ہے کہ ایک شخص جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے کہا کہ کوئی شخص تو اس ارادے سے لڑتا ہے کہ میں مالِ غنیمت حاصل کروں۔ کوئی شخص اس لیے لڑتا ہے کہ لوگوں میں میری بہادری کی شہرت ہو، کوئی شخص اِس لیے لڑتا ہے کہ لوگوں میں یہ دیکھا جائے کہ اس کا مرتبہ اور درجہ کتنا اُونچا ہے تو بتایئے کہ فی سبیل اللہ کون ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا فهو في سبيل الله۔ جو شخص اس لیے لڑائی لڑ رہا ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو جائے۔ یعنی اللہ کا قانون کسی ملک میں، کسی قوم میں نافذ ہو جائے اور اللہ کا دین اس کا بتلایا ہوا نظام زندگی عملی طور سے رائج ہو جائے۔ اور خدا کے بندے واقعہ میں خدا کے بندے بن کر صرف اس کی اطاعت کریں۔ اور اُس کا دوسرا پہلو بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث میں ذکر ہے کہ جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاں سارے لوگ پیش ہوں گے۔ تو عالم کہے گا کہ میں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے علم حاصل کیا تھا مجھے اس نیک عمل کا بدلہ ملنا چاہیے۔ ایک مال خرچ کرنے والا کہے گا کہ میں نے اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کیا تھا مجھے آج اس کا ثواب ملنا چاہیے۔ اور ایک ایسا شخص جو لڑائی لڑتا ہوا مارا گیا ہو، کہے گا کہ میں اللہ کی راہ میں شہید ہوا ہوں میں بھی اس شہادت کے اجر و ثواب کی اُمید رکھتا ہوں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ قلوب کی نیتوں کو جانتا ہے۔ سینوں کے راز اُس کو معلوم ہیں کوئی اندر کی بات اس سے مخفی نہیں رہ سکتی۔ زبان سے جو کوئی جو بھی دعویٰ کرے کرتا رہے۔ نرے دعووں سے کچھ نہیں ہوتا۔ چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عالم دین سے فرمائے گا کہ تو نے علم میری خاطر اور میری رضا کے لیے حاصل نہیں کیا تھا بلکہ اس لیے لیقال انک قارئ وقد قیل کہ تاکہ لوگوں میں چرچا ہو کہ فلاں صاحب بہت بڑے عالم فاضل ہیں اور لوگوں نے دنیا میں تجھے عالم فاضل کہہ دیا۔ جس مقصد کے لیے تحصیلِ علم تھی وہ مقصد تو حاصل کر چکا ہے میرے لیے تو نے یہ کام نہیں کیا تھا اب مجھ سے یہاں کیا بدلہ مانگتے ہو اور کس اجر و ثواب کی توقع رکھتے ہو۔ اور اس ریاکار اور شہرت طلب کے بارے میں حکم ہوگا فیسحب علی وجہہ النار کہ اس کو جہنم کی آگ میں ڈال کر گھسیٹا جائے۔ اور اس کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے گا۔ مال والے سے کہا جائے گا کہ ہاں تو نے بہت مال خرچ کیا تھا۔ مگر میرے لیے نہیں، میری رضا حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ صرف اس لیے لیقال انک جواد وقد قیل کہ لوگوں میں یہ بات مشہور ہو جائے کہ فلاں شخص بہت سخی اور خرچیلا ہے اور لوگوں نے تجھے سخی کہا۔ اور سخی کی حیثیت سے تیری شہرت ہو گئی یہی تیرا مقصد تھا وہ پورا ہوا۔ یہاں اب مجھ سے کیا اجر و ثواب کی امید رکھتے ہو۔ اور اس ریاکار اور شہرت کے طلب گار کے بارے میں حکم خداوندی ہوگا کہ جہنم کی آگ میں ڈال کر گھسیٹا جائے۔ چنانچہ حکم خداوندی کی تعمیل ہو جائے گی۔ اور فیسحب علی وجہہ النار اس کو دوزخ کی آگ میں ڈال کر گھسیٹا جائے گا۔ شہید کہلانے والے اور اجر و ثواب کی توقعات باندھنے والے شخص سے ارشاد ہوگا کہ تو اس لیے لڑتا رہا اور لڑتے لڑتے مارا گیا ہے کہ لوگوں میں تیری شجاعت و بہادری کی شہرت ہو جائے ولیقال انک شجاع وقد قیل اور کہا جائے کہ فلاں شخص اس قدر دلیر اور بہادر تھا۔ اور اس طرح جان نثاری کے ساتھ لڑتا اور دشمنوں کی صفوں میں گھستا رہا ہے۔ دنیا میں تجھے شجاع کہا گیا۔ تیری بہادری کا سکہ بیٹھ گیا جس غرض کو سامنے رکھ کر لڑتے رہے ہو تیری وہ غرض تو پوری ہو گئی۔ میرے لیے قتال تو نے نہیں کیا تھا۔ اس لیے مجھ سے اب کس چیز کا بدلہ لینا چاہتے ہو۔ اس کے بارے میں بھی حکم ہوگا اور فیسحب علی وجہہ النار اور دوزخ کی آگ میں ڈال کر اوندھے منہ گھسیٹا جائے گا۔

اس صحیح حدیث کے اس مضمون کو مستحضر کر کے ہر شخص کو سوچنا چاہیے کہ وہ جو بھی نیک عمل

کر رہا ہے۔ اس کی اصل نیت کیا ہے۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر و ثواب تب ملے گا جب وہ نیک عمل خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کیا گیا ہو اور اس کی خوشنودی پیش نظر ہو۔ شہادت و جان نثاری ایک عمل صالح ہے۔ اور اس کی فضیلت تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ مگر یہ فضیلت تب ہوگی۔ جب خالص نیت کے ساتھ فی سبیل اللہ ہو اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے ہو۔ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو اخلاصِ عمل اور رضائے الٰہی کے حصول کا جذبۂ صادقہ نصیب فرمائے۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پہ آیات و احادیث ہوں۔ ان کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔

(ادارہ)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبۂ رحم

جناب غ ۔ ل کاشمیری صاحب ۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

رحم، عواطف کی وہ رقت اور نرمی ہے جس سے کسی دوسرے انسان کے لیے احسان اور شفقت کا جذبہ جوش زن ہوتا ہے ۔ لہٰذا رحم میں محبت، فضل، احسان، ایثار، تواضع سبھی شامل ہیں ۔ رحم انسان کے بنیادی اخلاق میں سے ہے ۔ اس کے برخلاف، ظلم، سنگ دلی، شقاوت، غرور وغیرہ سبھی بد اخلاقیاں اس شخص میں ہوں گی جو بے رحم ہوگا ۔ خود اللہ تعالیٰ کے ناموں میں رحمٰن اور رحیم کا لفظ ملتا ہے

دُنیا میں رحم کے جو آثار پائے جاتے ہیں وہ اسی خدائی رحمت کے آثار و پرتو ہیں ۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے ۔ " خدا نے رحمت کے سو حصے کیے ۔ جن میں سے ننانوے حصے اپنے پاس رکھ لیے اور زمین پر صرف ایک حصہ نازل فرمایا ۔ اس ایک حصے کی بدولت لوگ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں ۔ یہاں تک کہ گھوڑا اس خوف سے اپنے بچے پر پاؤں نہیں رکھتا کہ کہیں اُسے دُکھ نہ ہو" ۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے " الرحم شجنة من الرحمٰن " رحم رحمان کی جڑ سے نکلی ہوئی شاخ ہے" ۔

بنی نوع انسان میں محاسنِ اخلاق کا سب سے بڑا مظہر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے ۔ آپ کی صفت قرآنِ پاک میں اس طرح آئی ہے ۔ " لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۔

" لوگو! تمہارے پاس تمہارے ہی اندر سے رسول آیا ہے ۔ تمہاری تکلیف اس

پر شاق گذرتی ہے۔ وہ مومنوں کے ساتھ شفقت اور رحم سے پیش آتا ہے"۔

آنحضرتؐ نے جس رحم دلی کی تعلیم دی ہے وہ صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں بلکہ غیر مسلم جو کسی بھی مذہب و ملت سے تعلق رکھتے ہوں، سب کے ساتھ پیار و محبت کی اور رحم دلی کی تعلیم دی ہے۔ حتیٰ کہ اس میں جانور تک شامل ہیں۔ آپ کی مشہور حدیث ہے۔

"مَن لَّا يَرحَمُ لَا يُرحَمُ"

"جو کسی پر رحم نہیں کرتا اُس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا"۔

اگرچہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا رحم معاشرے کے ہر شخص کے لیے ہے، چاہے وہ بچہ ہو مرد ہو یا عورت ہو۔ لیکن یہاں ہم صرف حضورؐ کے اس جذبۂ رحم کو بیان کریں گے جو آپ نے اپنے مخالفین کے ساتھ روا رکھا ہے۔

تمام اربابِ سیر شاہد ہیں کہ آنحضرتؐ نے کبھی کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا۔ صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ نے کبھی کسی سے ذاتی معاملہ میں انتقام نہیں لیا۔ بجز اس صورت کے کہ اُس نے احکام الٰہی کو توڑا ہو۔

جنگ اُحد کی شکست سے بھی زیادہ رؤسائے طائف کے تحقیر آمیز برتاؤ کی یاد، خاطرِ اقدس پر نہایت گراں تھی۔ تاہم دس برس کے بعد غزوۂ طائف میں جب وہ ایک طرف منجنیق سے مسلمانوں پر پتھر برسا رہے تھے تو دوسری طرف ایک سراپائے رحم خود آنحضرتؐ یہ دعا کر رہے تھے کہ خدایا انہیں سمجھ عطا کر۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ۹ھ میں جب اُن کے وفد نے مدینہ کا رُخ کیا تو آپ نے صحنِ مسجد میں ان کو مہمان بنایا اور عزت و حرمت کے ساتھ ان سے پیش آئے۔ قریش نے آپ کو گالیاں دیں، مارنے کی دھمکی دی، راستوں میں کانٹے بچھائے، جسمِ اطہر پر نجاستیں ڈالیں، گلے میں پھندا ڈال کر کھینچا، آپ کی شان میں گستاخیاں کیں۔ نعوذ باللہ کبھی جادوگر، کبھی پاگل، کبھی شاعر کہا، لیکن آپؐ نے کبھی ان باتوں پر برہمی ظاہر نہیں کی۔ حالانکہ ایک عام آدمی بھی ایک عام جلسہ میں جھٹلا یا جائے تو وہ غصہ سے کانپ اُٹھتا ہے۔

ایک صاحب جنہوں نے آنحضرتؐ کو ذوالمجاز کے بازار میں اسلام کی دعوت دیتے ہوئے دیکھا تھا، بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ فرما رہے تھے کہ لوگو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہو تو نجات پاؤ گے۔

پیچھے پیچھے ابوجہل تھا۔ وہ آپ پر خاک اڑا اڑا کر کہہ رہا تھا "لوگو اس شخص کی باتیں تم کو اپنے مذہب سے برگشتہ کر دیں گی۔ یہ چاہتا ہے کہ تم اپنے دیوتاؤں، لات و عزّیٰ کو چھوڑ دو"۔ راوی کہتا ہے کہ آپ اس حالت میں اس کی طرف مڑ کر دیکھتے بھی نہ تھے۔

سب سے بڑھ کر طیش و غضب کا موقع اِفک کا واقعہ تھا جب کہ منافقین نے حضرت عائشہ رضؓ پر نعوذ باللہ تہمت لگائی تھی۔ حضرت عائشہؓ آپ کی محبوب ترین بیوی اور ابوبکرؓ جیسے یارِ غار اور افضل الصحابہ کی صاحبزادی تھیں۔ شہر منافقوں سے بھرا پڑا تھا جنہوں نے دم بھر میں اس خبر کو اس طرح پھیلا دیا کہ سارا مدینہ گونج اٹھا۔ دشمنوں کی شماتت، ناموس کی بدنامی، بیوی کی تفضیح، یہ باتیں انسانی صبر و تحمل میں نہیں سما سکتیں۔ تاہم رحمتِ عالم نے ان سب باتوں کو شانِ رحیمی کے ساتھ سُنا۔ تہمت کا تمام تر بانی رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی تھا اور آپ کو بخوبی علم تھا۔ مگر اس واقعہ کی تکذیب خود خدا نے کر دی، اور تہمت لگانے والوں کو شرعی سزا دی گئی۔ تاہم عبداللہ بن ابی کو اس بنا پر چھوڑ دیا گیا کہ اس کو تہمت لگانے کا اقرار نہ تھا اور ثبوت کے لیے شرعی شہادت موجود نہ تھی۔ مدینہ کے منافق یہودیوں میں سے لبید بن عاصم نے آپ پر جادو کر دیا تھا۔ آپؐ نے کچھ تعرض نہ فرمایا۔ حضرت عائشہؓ نے مزید تحقیق کی تحریک کی تو فرمایا کہ مَیں لوگوں میں شورش نہیں پیدا کرنا چاہتا۔ زید بن سعنہ جس زمانے میں یہودی تھے، لین دین کا کاروبار کرتے تھے۔ آنحضرتؐ نے اُن سے کچھ قرض لیا۔ ابھی ادائیگی میں کچھ دن باقی تھے کہ زید تقاضے کو آئے اور آنحضرتؐ کی چادر پکڑ کر کھینچی اور آپؐ کو سخت سُست کہہ کر کہا "عبدالمطلب کے خاندان والو! تم ہمیشہ یوں ہی حیلے کیا کرتے ہو"۔ حضرت عمرؓ غصہ سے بے تاب ہو گئے اور اُس کی طرف مخاطب ہو کر کہا "او دشمنِ خدا تُو رسول اللہ کی شان میں گستاخی کرتا ہے"۔ آنحضرتؐ نے مسکرا کر کہا "عمر تمہیں کچھ اس کو سمجھانا چاہیے تھا کہ نرمی سے تقاضا کرے اور مجھ سے یہ کہنا چاہیے تھا کہ میں اس کا قرض ادا کر دوں"۔ یہ فرما کر حضرت عمرؓ کو ارشاد فرمایا کہ قرضہ ادا کر کے بیس صاع کھجور کے اور زیادہ دے دو"۔

ایک دفعہ آپ کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا رہ گیا تھا اور وہ بھی موٹا، پسینہ آتا تو

اور بھی بوجھل ہو جاتا، اتفاق سے ایک یہودی کے پاس شام سے کپڑے آئے۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کی کہ ایک جوڑا اُس سے قرض منگوالیں۔ آنحضرت نے یہودی کے پاس آدمی بھیجا۔ اُس گستاخ نے کہا کہ "میں سمجھا، کیا میرا مال اُڑانے اور قیمت ہضم کرنے کا ارادہ ہے؟"۔ آنحضرت نے یہ ناگوار جملے سُن کر صرف اس قدر فرمایا کہ "وہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے زیادہ محتاط اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنے والا ہوں"۔ ایک دفعہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ ایک عورت قبر کے قریب بیٹھی رو رہی تھی۔ آپؐ رُک گئے اور اس سے مخاطب ہو کر فرمایا "صبر کرو"۔ وہ آپ کو پہچانتی نہ تھی، گستاخی کے ساتھ بولی "چلو ہٹو تم کیا جانتے ہو کہ مجھ پر کیا قیامت ٹوٹی ہے"۔ آپ چلے آئے۔ لوگوں نے عورت سے کہا "تو نے نہیں پہچانا وہ رسول اللہ تھے"۔ وہ واپس آئی اور کہا "میں حضورؐ کو پہچانتی نہ تھی"۔ آپ نے فرمایا "صبر وہی معتبر ہے جو عین مصیبت کے وقت کیا جائے"۔

ایک مرتبہ سعدؓ بن عبادہ بیمار پڑے۔ عبداللہ بن اُبی (جو رئیس المنافقین تھا) بھی جلسہ میں موجود تھا۔ آپ کی سواری کی گرد اُڑی تو اُس نے چادر ناک پر رکھ لی۔ جب آپ سواری پر سوار ہو کر حضرت سعد کی عیادت کو گئے اور آنحضرتؐ سے کہا "دیکھو گرد نہ اُڑاؤ، جب آنحضرتؐ قریب پہنچے تو اُس نے کہا محمدؐ اپنا گدھا ہٹاؤ۔ تمہارے گدھے کی بدبو نے میرا دماغ پریشان کر دیا ہے"۔ آنحضرت نے سلام کیا، پھر سواری سے اُترے اور اسلام کی دعوت دی۔ عبداللہ بن ابی نے کہا کہ "ہمارے گھر آکر ہمیں نہ سناؤ۔ جو شخص خود تمہارے پاس جائے اُسے تعلیم دو"۔ مگر آپ خاموش رہے۔ عبداللہ بن رواحہ جو مشہور شاعر تھے، اُنھوں نے کہا آپ ضرور تشریف لائیں۔ بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی کہ قریب تھا کہ تلواریں نکل آئیں۔ آنحضرتؐ نے دونوں فریقوں کو سمجھا بُجھا کر ٹھنڈا کیا۔ جلسہ سے اُٹھ کر آپؐ سعد بن عبادہ کے پاس آئے اور اُن سے کہا "تم نے عبداللہ کی باتیں سُنیں"۔ سعد بن عبادہ نے عرض کی کہ آپؐ کچھ خیال نہ فرمائیں، یہ وہی شخص ہے کہ آپ کی تشریف آوری سے قبل اہلِ مدینہ نے جس کے لیے ریاست کا تاج تیار کر لیا تھا، اب یہ حسد کی وجہ سے کرتا ہے۔ غزوہ حنین میں آپؐ نے مالِ غنیمت تقسیم فرمایا تو ایک انصاری نے کہا "یہ تقسیم خدا کی رضامندی کے

لیے نہیں ہے۔" آپ نے سنا تو فرمایا "خدا موسیٰ پہ رحم کرے اُن کو لوگوں نے اس سے بھی زیادہ ستایا تھا۔"

ایک دفعہ ایک بدو خدمتِ اقدس میں آیا۔ آپ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ اس کو پیشاب کی حاجت ہوئی وہ آدابِ مسجد سے واقف نہ تھا۔ وہیں کھڑے ہو کر پیشاب کرنے لگا۔ لوگ ہر طرف سے دوڑ پڑے کہ اُس کو سزا دیں۔ آپؐ نے فرمایا "اسے جانے دو اور پانی کا ایک ڈول لاکر بہادو۔ خدا نے تم کو دشواری کے لیے نہیں بلکہ آسانی کے لیے بھیجا ہے۔"

حضرت انسؓ جو خادمِ خاص تھے، ان کا بیان ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نے مجھے کسی کام کے لیے بھیجنا چاہا۔ میں نے کہا میں نہ جاؤں گا۔ آپ چُپ ہو گئے۔ میں یہ کہہ کر باہر چلا گیا، دفعتہً آنحضرتؐ نے پیچھے سے آکر میری گردن پکڑ لی۔ میں نے مُڑ کر دیکھا تو آپ ہنس رہے تھے۔ پھر پیار سے فرمایا "انیس جس کام کے لیے کہا اب تو جاؤ۔" میں نے عرض کی کہ اچھا جاتا ہوں۔ اُس نے اس واقعہ کے ساتھ بیان کیا کہ میں نے سات برس آپ کی خدمت کی کبھی یہ نہ فرمایا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا، یہ کیوں نہیں کیا۔"

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ کی عادت تھی کہ ہم لوگوں کے ساتھ مسجد میں بیٹھ جاتے اور باتیں کرتے جب اُٹھ کر گھر میں جاتے تو ہم لوگ بھی چلے جاتے۔ ایک دن حسبِ معمول مسجد سے نکلے، ایک بدو آیا اور اُس نے آپ کی چادر اس زور سے کھینچی کہ آپ کی گردن سُرخ ہو گئی۔ آپ نے مُڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بولا کہ "میرے اُونٹوں کو غلہ سے لاد دے، تیرے پاس جو مال ہے وہ نہ تیرا ہے نہ تیرے باپ کا"۔ آپؐ نے فرمایا کہ "پہلے میری گردن کا بدلہ دو، تب غلہ دے دیا جائے گا"۔ وہ بار بار کہتا تھا کہ خدا کی قسم میں ہرگز بدلہ نہ دوں گا۔ آپؐ نے اس کے اُونٹوں پر جَو اور کھجوریں لادویں اور کچھ تعرض نہ فرمایا۔

قریش نعوذ باللہ آنحضرت کو گالیاں دیتے بُرا بھلا کہتے۔ منہ سے آپ کو محمدؐ (تعریف کیا گیا) کی بجائے مذمم (مذمت کیا گیا) کہتے، لیکن آپ اُن کے جواب میں اپنے دوستوں کو خطاب کر کے صرف اسی قدر فرماتے کہ "تمہیں تعجب نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ قریش کی گالیوں کو مجھ سے کیونکر پھیرتا ہے۔ وہ مذمم کو گالیاں دیتے اور لعنت بھیجتے ہیں اور میں تو محمدؐ ہوں۔"

فرات بن حیان ایک شخص ابوسفیان کی طرف سے مسلمانوں کی جاسوسی پر مامور تھا۔ آپؐ کی ہجو میں اشعار کہتا تھا۔ ایک دفعہ پکڑا گیا تو بولا کہ میرے قتل کا حکم ہوا ہے، مگر میں مسلمان ہوں۔ ایک انصاری نے آکر اطلاع دی کہ وہ کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ "تم میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے ایمان کا حال ہم انہی پر چھوڑتے ہیں، اُن میں سے ایک فرات بن حیان ہے"۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ بعد میں صدقِ دل سے مسلمان ہوا اور آپؐ نے اس کو یمامہ میں ایک زمین بھی عنایت فرمائی جس کی آمدنی ۲۲۰۰ تھی۔

ایک انسان کے ذخیرۂ اخلاق میں سب سے زیادہ کمیاب و نادر الوجود چیز دشمنوں پر رحم اور ان سے عفو و درگزر ہے۔ لیکن حاملِ وحی و نبوت کی ذاتِ اقدس میں یہ جنس فراواں تھی۔ دشمن سے کام لینا انسان کا قانونی فرض ہے۔ دائرۂ شریعت میں آکر یہ فرضیت بن جاتی ہے۔ دشمنوں سے انتقام لینے کا سب سے بڑا موقع فتح مکہ کا دن تھا جب کہ وہ کینہ جو سامنے آئے جو آنحضرتؐ کے خون کے پیاسے تھے اور جن کے دستِ ستم سے آپؐ نے طرح طرح کی اذیتیں اُٹھائی تھیں، لیکن ان سب کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا گیا۔

لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء"

تم پر کوئی ملامت نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔

وحشی جو اسلام کے قوتِ بازو اور آنحضرتؐ کے عزیز ترین چچا حضرت حمزہؓ کا قاتل تھا، مکہ میں رہتا تھا۔ جب مکہ میں اسلام کی قوت غالب آئی تو بھاگ کر طائف چلا گیا۔ جب طائف بھی مطیع ہوا تو وحشی کے لیے کوئی بھی جگہ جائے امن نہ رہی لیکن اس نے سُنا کہ آنحضرتؐ سفراء سے کبھی بھی سختی سے پیش نہیں آتے۔ ناچار خود رحمتِ عالم کے دامن میں پناہ لی اور اسلام قبول کیا۔ آپ نے صرف اس قدر فرمایا کہ میرے سامنے نہ آیا کر، کہ تم کو دیکھ کر مجھے چچا کی یاد آتی ہے۔

ہندہ زوجہ ابوسفیان جس نے حضرت حمزہؓ کا سینہ چاک کیا اور دل و جگر کے ٹکڑے کیے فتح مکہ کے روز نقاب پوش ہو کر آئی کہ آنحضرتؐ پہچان نہ سکیں اور بیعت بے خبری میں سند امان حاصل کر لے۔ مگر اس موقع پر بھی کچھ بھدی سی بات کہی۔ آنحضرتؐ نے ہندہ کو پہچان لیا مگر اس

واقعہ کا ذکر تک نہ فرمایا ۔ ہندہ اس کرشمہ اعجاز سے متاثر ہو کر بے اختیار بولی " یا رسول اللہ آپ کے خیمہ سے مبغوض تر خیمہ کوئی بھی میری نگاہ میں نہ تھا ۔ لیکن آج آپ کے خیمہ سے محبوب تر خیمہ میری نظر میں کوئی دوسرا نہیں ہے " ۔

عکرمہ دشمن اسلام ابوجہل کے فرزند تھے اور اسلام سے قبل اپنے باپ کی طرح آنحضرتؐ کے سخت ترین دشمن تھے ۔ فتح مکہ کے وقت مکہ سے بھاگ کر یمن چلے گئے ۔ ان کی بیوی مسلمان ہو چکی تھی ۔ وہ یمن گئیں عکرمہ کو تسکین دی ، ان کو مسلمان کیا اور خدمت اقدس میں لے کر حاضر ہوئیں آنحضرتؐ نے اُن کو دیکھا تو فرط مسرت سے فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور اس تیزی سے ان کی طرف بڑھے کہ جسم مبارک پر چادر تک نہ تھی اور زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے ۔

" مرحبا بالراکب المھاجر "

" اے ہجرت کرنے والے سوار تمہارا آنا مبارک ہو "

صفوان بن اُمیہ قریش کے رؤسائے کفر میں سے اور اسلام کے شدید ترین دشمن تھے ۔ ان ہی نے عمیر بن وہب کو انعام کے وعدوں پر آنحضرتؐ کے قتل پر مامور کیا تھا ۔ جب مکہ فتح ہوا تو اسلام کے ڈر سے جدہ بھاگ گئے اور قصد کیا کہ سمندر کے راستے سے یمن چلے جائیں گے ۔ عمیر بن وہب نے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ " یا رسول اللہ امان کی کوئی نشانی مراحمت فرمایئے جس کو دیکھ کر اُن کو میرا اعتبار آئے " ۔ آپ نے عمامہ مبارک اُن کو عنایت فرمایا جس کو لے کر وہ صفوان کے پاس پہنچے ۔ صفوان نے کہا مجھے وہاں جانے میں جان کا ڈر ہے ۔ عمیر نے جواب دیا " صفوان ! ابھی تمہیں محمدؐ کے حلم و عفو کا اندازہ نہیں ہوا " ۔ یہ سُن کر وہ عمیر کے ساتھ دربار نبوی میں حاضر ہوئے اور سب سے پہلا سوال یہ کیا کہ عمیر کہتے ہیں کہ آپؐ نے مجھے امان دی ہے ۔ فرمایا " سچ ہے " ۔ صفوان نے کہا تو مجھے دو مہینے کی مہلت دو ۔ ارشاد ہوا کہ " تم کو چار مہینے کی مہلت دی جاتی ہے " ۔

اس کے بعد وہ اپنی خوشی سے مسلمان ہو گئے ۔ یہ واقعہ تفصیل سے ابن ہشام میں مذکور ہے ۔ ہبار بن الاسود وہ شخص تھا جس کے ہاتھ سے آنحضرتؐ کی صاحبزادی زینب کو سخت تکلیف ہوئی تھی ۔ حضرت زینب حاملہ تھیں اور مکہ سے مدینہ ہجرت کر رہی تھیں ۔ کفار نے مزاحمت کی

اور ہبار بن الاسود نے جان بوجھ کر آپ کو اونٹ سے گرا دیا۔ جس سے اُن کو سخت چوٹ آئی اور حمل ساقط ہوگیا۔ اس کے علاوہ اور بھی بعض جرائم کا وہ مرتکب ہوا تھا اور اسی بنا پر فتح مکہ کے وقت ہبار کے قتل کا حکم ہوا تھا۔ اس نے چاہا کہ بھاگ کر ایران چلا جائے کہ داعئ ہدایت نے خود آستانہ نبوت کی طرف جھکا دیا۔ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی یارسول اللہ میں بھاگ کر ایران چلا جانا چاہتا تھا مگر پھر مجھے حضورؐ کے احسانات اور حلم وعفو یاد آئے۔ میری نسبت آپ کو جو خبریں پہنچیں وہ درست تھیں۔ مجھے اپنی جہالت اور قصور کا اعتراف ہے۔ اب اسلام سے مشرف ہونے آیا ہوں۔ دفعتہً رحمت کا باب وا ہوا اور دوست و دشمن کی تمیز یکسر ختم ہو گئی۔

ابوسفیان اسلام لانے سے قبل جیسے تھے غزواتِ نبوی کا ایک ایک واقعہ اس پر شاہد ہے۔ بدر سے لے کر فتح مکہ تک جتنی لڑائیاں اسلام کو لڑنی پڑیں، ان میں اکثر میں ان کا ہاتھ تھا۔ مگر جب فتح مکہ کے روز گرفتار کر کے لائے گئے تو حضرت عباس ان کو لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو آپؐ ان کے سامنے محبت سے پیش آئے۔ حضرت عمرؓ نے گذشتہ جرائم کی پاداش میں ان کو قتل کرنے کا ارادہ کیا مگر آپؐ نے منع فرمایا اور نہ صرف یہ کہ ان کے گھر کو امن و امان کا ٹھکانہ بنا دیا اور فرمایا کہ جو فرد ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اُس کا قصور معاف ہوگا۔ کیا دنیا کے کسی فاتح نے اپنے دشمن کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا ہے؟

عرب کا ایک ایک قبیلہ اسلام کے پرچم تلے جمع ہو رہا تھا۔ اگر کسی قبیلہ نے آخر تک سرتابی کی تو وہ بنو حنیفہ کا قبیلہ تھا جس میں مسیلمہ نے دعوئ نبوت کیا تھا۔ ثمامہ ابن آثال اس قبیلہ کے رؤسا میں سے تھا۔ اتفاق سے وہ مسلمانوں کے ہاتھ لگ گیا۔ گرفتار کر کے مدینہ لائے گئے۔ آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ اس کو مسجد کے ستون کے ساتھ باندھ دیا جائے، اس کے بعد آپ مسجد میں تشریف لائے اور اس سے دریافت کیا کہ کیا کہتے ہو۔ اُس نے کہا اے محمدؐ اگر تم مجھے قتل کرو گے تو ایک خون کرو گے اور اگر احسان کرو گے تو ایک شکر گزار پر احسان ہوگا اور اگر زر فدیہ چاہتے ہو تو تم مانگو میں دوں گا۔ یہ جواب سن کر آپؐ خاموش

رہے۔ دوسرے دن بھی یہی واقعہ دہرایا گیا۔ تیسرے دن بھی جب اُس نے یہی جواب دیا تو آپ نے حکم دیا کہ ثمامہ کی رسّی کھول دو اور آزاد کردو۔ ثمامہ پر اس خلاف توقع لطف و عنایت کا یہ اثر ہوا کہ قریب ایک درخت کی آڑ میں غسل کیا اور مسجد میں آکر کلمہ پڑھا اور مسلمان ہوگیا۔ اور عرض کی یارسول اللہ دُنیا میں کوئی شخص میری نظر میں آپ سے زیادہ مبغوض نہ تھا اور اب آپ سب سے زیادہ پیارے لگ رہے ہیں۔ کوئی شہر آپ کے شہر سے زیادہ ناپسند نہ تھا۔ اور اب کوئی شہر آپ کے شہر سے زیادہ پسندیدہ نہیں ہے۔

قریش کی ستم گری و جفاگری کی داستان دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یاد ہوگا کہ شعب ابوطالب میں تین برس تک ان ظالموں نے آپ کو اور آپ کے خاندان کو اس طرح محصور کر رکھا تھا کہ غلّہ کا ایک دانہ اندر پہنچ نہیں سکتا تھا، بچے بھوک سے روتے اور تڑپتے تھے اور یہ بیدرد اُن کی آوازیں سُن کر ہنستے اور خوش ہوتے تھے۔ لیکن معلوم ہے کہ رحمتِ عالم نے اس کے معاوضہ میں قریش کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ جب یہی ثمامہ بن آثال مکّہ گئے تو قریش نے تبدیلِ مذہب پر اُن کو طعنہ دیا۔ انہوں نے غصّہ سے کہا کہ خدا کی قسم اب رسول اللہ کی اجازت کے بغیر گیہوں کا ایک دانہ بھی مکّہ نہیں آئے گا۔ اس بندش سے مکّہ میں قحط پڑ گیا۔ آخر گھبرا کر قریش نے حضوؐر کی طرف رجوع کیا۔ حضوؐر کو رحم آیا اور ثمامہ کو کہلا بھیجا کہ بندش اُٹھا لو چنانچہ حسبِ دستور پھر غلّہ مکّہ آنے لگا۔

کفار کے ساتھ آپ کے حسنِ خلق کے بہت سے واقعات کے بارے میں مورخین یورپ مدعی ہیں کہ یہ اس وقت تک کے واقعات ہیں جب تک اسلام ضعیف تھا اور لطف و آشتی کے سوا چارہ نہ تھا۔ ہم یہاں صرف وہ واقعات نقل کریں گے جو اُس زمانہ کے ہیں جب کہ مخالفین کی قوتیں پامال ہو چکی تھیں اور اُن پر آنحضرتؐ کو پورا اقتدار حاصل ہو چکا تھا۔

ابوبصرہ غفاری کا بیان ہے کہ جب وہ کافر تھے آنحضوؐر کے پاس مدینہ میں آکر مہمان رہے رات کو گھر کی تمام بکریوں کا دُودھ پی گئے، لیکن آپؐ نے کچھ نہ فرمایا۔ رات بھر تمام اہلِ بیت نبوی بھوکے رہے۔

اِسی طرح ایک اور واقعہ حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ شب کو ایک کافر آپؐ کا مہمان

ہوا۔ آپ نے اُس کے سامنے بکری کا دُودھ پیش کیا۔ وہ پی گیا۔ پھر دوسری بکری دوہی گئی وہ دُودھ بھی بغیر تامل کے وہ پی گیا۔ پھر تیسری، پھر چوتھی، یہاں تک کہ سات بکریاں دوہی گئیں اور وہ سب کا دُودھ پی گیا۔ آپؐ نے کوئی غصہ ظاہر نہ فرمایا۔ شاید اِسی حسنِ اخلاق کا اثر تھا کہ وہ صبح کو مسلمان ہوگیا۔ حضرت اسماءؓ بیان کرتی ہیں کہ صلح حدیبیہ کے زمانہ میں اُن کی ماں مشرکہ تھیں۔ اعانت کے لیے حضرت اسماء کے پاس آئیں اُن کو خیال ہوا کہ اہل شرک کے ساتھ نیک سلوک نہیں کرنا چاہیے۔ آنحضرتؐ کے پاس آکر دریافت کیا۔ آپؐ نے فرمایا، اُن کے ساتھ نیکی کرو۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی ماں کافر تھیں اور بیٹے کے ساتھ مدینہ میں رہتی تھیں۔ جہالت سے آنحضرتؐ کو گالیاں دیتی تھی۔ ابو ہریرہؓ نے خدمتِ اقدس میں شکایت کی۔ آپؐ نے بجائے غیظ و غضب کے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو پھر وہ مسلمان ہوگئیں۔

(باقی)

"مصالح مرسلہ" بحیثیت مأخذ فقہ اسلامی

شفقت حسین خادم ایم اے - یونیورسٹی آف کراچی

"مصالح مرسلہ" (امام غزالیؒ نے اس کا نام استصلاح رکھا ہے۔ بعض علماء نے اس کا نام استدلال مرسل رکھا ہے اور امام الحرمین اور ابن سمعانی اسے استدلال کے نام سے موسوم کرتے ہیں)، وہ اصول ہیں جن کی تائید و تردید میں کوئی معین شرعی قاعدہ نہ ہو، ان کے ذریعے اُن شرعی مقاصد کی حفاظت کی جاتی ہے جن کا علم کتاب وسنّت یا اجماع سے حاصل ہوتا ہے مگر یہ کسی مقررہ اصول پر مبنی نہیں ہوتے۔ ان کا پتہ قرائن حالات اور دیگر علامات سے چلتا ہے اس لیے ان مصالح کو مرسلہ کہتے ہیں۔ کیونکہ اس سے متعلقہ احکام کسی معیّن دلیل کی پابندی سے آزاد ہوتے ہیں اور نصِ شرعی قیاس یا اجماع کے پابند نہیں ہوتے بلکہ اُن کے ذریعے کسی بڑی مصلحت کی تکمیل ہوتی ہے یا بہت بڑے فتنہ وفساد یا شدید ضرر ونقصان کا ازالہ کیا جاتا ہے یا شریعت کے اغراض ومقاصد مصالح عامہ، انصاف اور اُن بنیادی اصولوں کی تکمیل پیش نظر ہوتی ہے جن کی وجہ سے شریعت کا وجود عمل میں لایا گیا ہے۔ امام غزالیؒ ان کی توضیح اس طرح فرماتے ہیں "مصالح مرسلہ وہ ہیں جن کی بنیاد عقل کے مطابق مناسب حکم پر ہے اور ان کے ثبوت کے لیے کوئی متفقہ اصول نہ ہو"۔ خوارزمیؒ فرماتے ہیں " ان کا مقصد یہ ہے کہ عوام کی خرابیوں کو دُور کر کے شرعی مقاصد کی حفاظت کی جائے (فقہ الاسلام از حسن احمد الخطیب ترجمہ رشید احمد ارشد ص ۲۸۳، ۲۸۴ نفیس اکیڈمی کراچی)

امام مالکؒ نے استحسان سے ملتا جلتا ایک اصول بنام مصالح مرسلہ و استصلاح کے قائم کیا

اُن کے نزدیک ایک شرعی حکم اس مصلحتِ عامّہ پر نظر اور لحاظ کر کے قیاس کیا جا سکتا ہے، جس کو وہ مصالح مرسلہ اور استصلاح کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ امام الحرمین کی رائے بھی قریب قریب اسی کے تھی۔ (جمع الجوامع جلد ۲ ص ۱۰۱) لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مالکی فقہاء نے اس اصول سے جیسا کہ چاہیے تھا کام نہیں لیا اور ان کے متبعین فقہاء نے احناف کی طرح اس اصول کو غیر متعین اور غیر محدود ہونے کی وجہ سے اس قابل نہیں تصور کیا کہ وہ احکام شرعیہ کے استنباط کی بنیاد قرار پا سکے (مختصر جلد اوّل صفحہ ۲۸۱) اس اصول کے استعمال کی جو مثالیں پیش کی جاتی ہیں وہ بھی کوئی اچھی مثالیں نہیں ہیں۔ مثلاً بعض مالکی فقہاء نے اس اصول کی بنا پر سرقہ کے ملزم پر اقبال کرانے کی غرض سے سختی کا کیا جانا جائز قرار دیا ہے لیکن اس کے مقابلے میں یہ کہا جاتا ہے کہ مجرم کا چھوٹ جانا اس سے بہتر ہے کہ کسی بے گناہ پر سختی کی جائے (جمع الجوامع جلد ۲ ص ۱۰۲)۔

ہر کیف مالکی فقہ میں مصالح مرسلہ کو ایسے مسائل کے حل کرنے میں دلیل بنایا جاتا ہے، جن کے حل کرنے میں دیگر دلائل شرعیہ خاموش ہوں۔ امام مالکؒ کے نزدیک مصلحت بھی ایک دلیل شرعی ہے جس کا نام اُنھوں نے مصالح مرسلہ رکھا ہے جس کا عام فہم مفہوم یہ ہے کہ جب مصالح عامّہ کے لیے کوئی عام فہم نص موجود نہ ہو تو حکم کو کسی ایسے ضابطہ معنوی سے منسلک کر دیا جائے جو مصلحتِ عامّہ اور منشائے شریعت دونوں کے موافق ہو (ریاض الفقہ۔ از عبدالغنی قادری ص ۳۷)۔

مصالح مُرسلہ تین طرح کے ہوتے ہیں:۔

۱۔ ایک وہ کہ جن کے اعتبار کی شریعت نے شہادت دی ہے ان کے معتبر ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں مثلاً حرج کی وجہ سے بارش میں "جمع بین الصلوٰتین" کا جواز، اور اس کی اصل شریعت میں ملتی ہے کہ حرج ہی کی وجہ سے شریعت نے سفر میں جمع بین الصلوٰتین کو جائز کیا ہے۔ (غایۃ الوصول شرح لب الاصول از زنجانی ص ۱۳۲، عیسیٰ البابی الحلبی مصر)۔ امام غزالیؒ نے اس مصلحت کے اعتبار کے بارے میں لکھا ہے کہ "ویرجع حاصلھا الی القیاس"۔ اور اس کی مثال یہ ذکر کی ہے کہ خمر پر قیاس کرتے ہوئے ہر مسکر پر حرمت کا حکم لگانا" (المستصفیٰ

من علم الاصول از غزالیؒ ج ۱ ص ۲۸۴، المطبعہ منیریہ بولاق مصر) مزید تفصیل کے لیے "الاعتصام" از شاطبیؒ جلد دوم صفحہ ۹۶، مکتبہ تجاریۃ الکبری مصر، ملاحظہ ہو۔

۲۔ دوسرے وہ جن کے غیر معتبر ہونے کی شریعت نے شہادت دی ہے مثلاً یحیٰ تلمیذ مالکؒ کا واقعہ کہ انہوں نے عبدالرحمن بن حکم کو کفارہ صوم میں اعتاق کے بجائے مصلحت زجر کی وجہ سے روزوں کا حکم دیا ملاحظہ ہو" مختصر من منتہی الاصول از ابن حاجب، المطبعۃ الکبری الامیریۃ بولاق مصر"

۳۔ تیسرے وہ کہ نہ شریعت نے ان کے اعتبار کی شہادت دی ہے اور نہ عدم اعتبار کی، عام طور پر ان ہی کو مصالح مرسلہ کہا جاتا ہے۔

مصالح مرسلہ کی تعریف امام ابن تیمیہؒ نے مصالح مرسلہ کی یہ تعریف کی ہے "مصالح مرسلہ سے مراد یہ ہے کہ مجتہد محسوس کرے کہ اس فعل میں مصلحت راجحہ موجود ہے اور شرع میں اس کے خلاف کوئی حکم نہیں ہے"۔ (مجموعہ الرسائل والمسائل جلد سوم صفحہ ۲۲)۔

امام شاطبیؒ نے یہ تعریف کی ہے" والمصالح المرسلۃ وھی التی لا یشھد لھا اصل بالاعتبار فی الشرع ولا بالالغاء وان کانت علی سنن المصالح و تلقتھا العقول بالقبول"۔ (الموافقات جلد اول صفحہ ۳۹، مکتبۃ التجاریۃ الکبری مصر)

البیضاوی نے یہ تعریف کی ہے" المصالح المرسلۃ وھی التی لم یشھد لھا اصل شرعی من نص او اجماع لا بالاعتبار ولا بالالغاء (منہاج الوصول من علم الاصول، مطبعۃ کردستان العلمیہ مصر)۔

شوکانیؒ نے یہ تعریف کی ہے" ھی ان یوجد معنی یشعر من الحکم المناسب عقلا ولا یوجد اصل متفق علیہ (ارشاد الفحول الی تحقیق الحق من علم الاصول ص ۲۴۲، مطبع البابی الحلبی مصر)۔

ابن امیر الحاج نے یہ تعریف کی ہے" ھی التی لا یشھد لھا اصل بالاعتبار فی الشرع ولا بالالغاء وان کانت علی سنن المصالح و تلقتھا العقول بالقبول (التقریر والتحبیر جلد ۳ ص ۲۸۶، المطبعۃ الکبری الامیریہ بولاق مصر)۔

مولانا محمد تقی امینی صاحب نے یہ تعریف رقم فرمائی ہے "صرف ضرورت اور مصلحت کو بنیاد بنا کر مسائل استنباط کرنے کا نام استصلاح یا مصالح مرسلہ ہے (فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر صفحہ ۲۳۷، اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور، ایڈیشن مئی ۱۹۷۵ء)

ضرورت و مصلحت کو بنیاد بنا کر مسائل کا استنباط کرنا جس طرح استحسان میں گذر چکا ہے اس سے زیادہ وسیع پیمانے پر مصالح مرسلہ میں ہوتا ہے۔ وہ خاص ہے اور عمومیت کے لحاظ سے عام ہے لیکن دوسری حیثیت سے استحسان عام ہے کہ اس میں قیاس خفی کا زاویۂ نگاہ موجود ہے اور استصلاح خاص ہے کہ اس میں صرف ضرورت و مصلحت کا زاویہ نگاہ کار فرما ہوتا ہے۔

وہ مصلحت مصالح مرسلہ کی تعریف میں داخل نہیں ہے جس کی تشخیص و تعیّن پر شریعت کی نص ہو، جیسے قرآن کے ضائع ہو جانے کے خطرے سے حفاظت کی خاطر اس کی کتابت اور قرآن کی تعلیم یا جس کے نوع کے متعلق شریعت کی نص ہو جیسے شریعت نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فقرے میں معروف کے سارے انواع اور منکر کے سارے اقسام کو لے لیا ہے تو اس طرح کی مصالح شریعت کی منصوص مصالح شمار ہوتی ہیں نہ کہ ان پر مصالح مرسلہ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ اور ان کے حکم میں شریعت کے اس نص کا اعتبار ہوا کرتا ہے نہ کہ استصلاح کا۔

مصالح و مقاصد کے نقطہائے نظر مصالح و مقاصد کے دو نقطہ ہائے نظر ہیں:

۱۔ ذاتی حیثیت :۔ اس معنی کی رو سے مصلحت کو منفعت اور مفسدہ کو مضرت کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ عام ازیں کہ یہ نفع و ضرر شخصی ہوں یا عام، غالب ہوں یا مغلوب، فوری ہوں یا مؤخر مثلاً علم، تجارتی نفع، لذّت، راحت، صحت وغیرہ کہ یہ ساری چیزیں اپنی ذات کے لحاظ سے مصالح ہیں اور جن لوگوں کو یہ حاصل ہوں ان کے لیے نفع بخش ہوں۔ چاہے ان کے حصول کا طریقہ جو بھی ہو اور جہل، خسارہ، صعوبت اور اَلم وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو اپنی ذات میں مضرت کے قبیل سے ہیں اور جو لوگ ان سے دوچار ہوں ان کے لیے ضرر رساں۔

۲۔ شرعی حیثیت :۔ وہ مصالح و مقاصد جو اسلامی قانون سازی میں امر و نہی کا پیمانہ بنتے ہیں وہ ہوں جو مقاصد شریعت سے ہم آہنگ ہوں۔

مقاصد شریعت | شریعت کے وہ مقاصد و مصالح جن کو اولیت حاصل ہے یہ ہیں:۔

۱- حفظِ دین ۲- حفظِ نفس ۳- حفظِ عقل ۴- حفظِ نسل ۵- حفظِ مال۔

اس کے بعد اپنی اہمیت کے درجات کے لحاظ سے اُن کے ساتھ اُن اُمور کی حفاظت بھی ضروری ہے جن کا ایک صالح معاشرہ محتاج ہوتا ہے یا جو حیاتِ صالحہ کو مکمل یا حسین بناتے ہیں۔ یہ مذکورہ پانچ اُمور وہ ہیں جن پر ہر زمانے کی الٰہی شریعتیں متفق رہی ہیں بلکہ غیر دینی قوانین میں بھی اپنے احترام اور اپنے حفظ و بقائکے واجب ہونے کی بنا پر یہ اُمور پنجگانہ ملحوظ رہا کرتے ہیں۔ امام غزالیؒ نے اپنی کتاب المستصفیٰ میں ذکر کیا ہے کہ کسی ملت میں بھی اُن کی حرمت نے اباحت کی شکل اختیار نہیں کی۔

مقاصد شریعت کی اقسام | شریعت کے مقاصد و مصالح تین اقسام پر مشتمل ہیں:۔

۱- مقاصد ضروریہ - وہ اعمال و تصرفات جن پر متذکرہ بالا پانچ اُمور کی حفاظت صیانت موقوف ہے۔ یہ پانچ اُمور وہ ہیں جو ایک حیات صالحہ کے لیے ناگزیر و لابدی ہیں اُن میں سے کسی کا بھی فقدان حیاتِ انسانی کی استقامت میں فساد اور خلل کا موجب بنتا ہے۔ چنانچہ عبادات کی مشروعیت حفظِ دین کی خاطر ہے کہ ان کے بغیر نہ دین کی تشکیل ہو سکتی ہے اور نہ دین کی عمارت قائم رہ سکتی ہے اور خورد و نوش اور لباس کے متعلقات اور رہائش کے لیے مکان کے استعمال وغیرہ سے شریعت کے احکام و ہدایات حفظِ نفس و عقل کے مصلحت و مقصد کے پیشِ نظر ہے کہ ان کے بغیر نہ جان محفوظ رہ سکتی ہے اور نہ عقل اور معاملات سے متعلق احکام حفظ نسل و مال کی غرض سے ہیں۔

یہ مقاصد و مصالح اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے جب تک جرائم کا استیصال نہ ہو جائے۔ مثلاً ارتداد، قتلِ ناحق، شربِ خمر، ارتکابِ زنا، غصب و سرقہ وغیرہ کہ یہ ایسے اُمور ہیں جو مقاصد ضروریہ کے لیے سدِ راہ ہیں ارتداد حفظِ دین کی راہ میں، خونِ ناحق حفظِ نفس کی راہ میں شربِ خمر حفظِ عقل کی راہ میں، زنا حفظِ نسل کی راہ میں، اور غصب و سرقہ حفظِ مال کی راہ میں سنگِ گراں کی نوعیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا مقاصد ضروریہ کی تحصیل کے لیے ان کا سدِ باب لازمی ہے قصاص، دیت، حدود وغیرہ جو سزائیں ہیں وہ اسی لیے ہیں کہ مقاصد ضروریہ کی تحصیل

کے راستے کی یہ رکاوٹیں دور ہوں۔

۲۔ مقاصدِ حاجیہ :۔ وہ اعمال و تصرفات جن کے بغیر مقاصد ضروریہ کی حفاظت ممکن تو ہے مگر جن کی حاجت اُن مقاصدِ ضروریہ کے حصول میں سہولت اور ان کی تکمیل میں آسانیاں بہم پہنچانے اور ضیق و تنگی، نقصان و حرج، اور مشقتوں کے دفیعہ کے لیے پیش آتی ہیں۔ جیسے شکار کی اجازت و اباحت اور طیبات سے استفادہ اور معاملات کی بہت سی انواع کہ انسان کا اُن سے مستغنی ہونا ممکن ہے مگر اسے ضیق و صعوبت اور بڑی مشقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

۳۔ مقاصد تحسینیہ یا کمالیہ :۔ وہ اُمور کہ جن کے ترک کر دینے سے کوئی حرج و فتور تو واقع نہیں ہوتا مگر مکارم اخلاق اور محاسن عادات کی کارفرمائیاں اُن سے وابستہ ہیں۔ مثلاً ترغیبِ عفو، قرض کی ادائیگی کے لیے تقاضا کرنے میں نرمی اختیار کرنے کی تعلیم، گفتگو کے آداب، خورونوش کے آداب، معاشرتی اور معاشی اُمور میں اعتدال وغیرہ۔

پس ہر وہ شے جو ان مقاصد شرعیہ کی تائید و مساعدت کرے وہ اسلامی فقہ کی نگاہ میں مطلوب مصلحت ہوگی اور ان اقسام میں سے حسبِ نوعیت کہیں تو اس کی طلب قوی ہوگی اور کہیں ضعیف اور ہر وہ چیز جو ان مقاصد شرعیہ کے منافی ہو اور اُن سے ٹکراتی ہو وہ ایسے مفسدہ میں شمار ہوگی جو ممنوع ہے اور مقصد شرعی میں خلل اندازی کی نوعیت کے لحاظ سے ان کی ممانعت شدید یا ضعیف ہوگی۔ (مقالہ اسلامی فقہ کے ماخذ از استاذ مصطفی احمد الزرقا ص ۲۰۶ تا ۲۰۹، چراغِ راہ، اسلامی قانون نمبر)

امام ابن تیمیہؒ کا نقطہ نظر

امام ابن تیمیہؒ اُن لوگوں کو سراسر غلط خیال کرتے ہیں جن کے نزدیک مصلحت صرف حفظ نفوس و اموال اور اعراض و عقول و ادیان پر مقصود و محدود ہے وہ ثابت کرتے ہیں کہ جس طرح مصلحت "مذکورہ اُمورِ خمسہ" کے دفع مضرت پر مشتمل ہے اسی طرح جلب منفعت بھی اس میں داخل ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں "مصالح مرسلہ کا تعلق جلبِ منافع و دفع مضار دونوں سے ہے۔ اور جو لوگ مذکورہ اُمور خمسہ کے دفع مضار کے سلسلے میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ مصالح مرسلہ کی صرف ایک قسم کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر جلبِ منفعت دین و دنیا ہر دو سے تعلق رکھتی

ہے۔ دُنیادی اُمور میں وہ معاملات واعمال داخل ہیں جن میں خلق کی بھلائی شامل ہو بشرطیکہ کوئی شرعی رکاوٹ نہ ہو اور دینی اُمور میں معارف واحوال اور زہد وعبادت داخل ہیں جن میں بغیر کسی منع شرعی کے مصلحت کارفرما نظر آتی ہے۔ پس جو کوئی مصالح کو عقوبات تک محدود رکھتا ہے وہ محدود فکر سے کام لیتا ہے (مجموعہ الرسائل والمسائل جلد ۳ ص ۲۴)

امام ابن تیمیہؒ کے نزدیک اصل شے وصفِ مناسب مبنی بر مصلحت ہوتا ہے، اس بنا پر وہ اسی مصلحت کو بہتر سمجھتے ہیں جس کے لیے دلیل شرعی سے شاہد خصوصی ہو نیز وہ عموم قیاس میں داخل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ کوئی ایسی مصلحت نہیں ملے گی جو قیاس میں داخل نہ ہو۔ امام صاحب فرماتے ہیں "قول جامع یہ ہے کہ شریعت قطعی طور پر مصلحت سے صرفِ نظر نہیں کرتی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس دین کی تکمیل فرمادی ہے اور بندوں پر اپنی نعمت تمام کر دی ہے۔ جنت سے قریب کرنے والی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے سیدالانبیا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے بیان نہ فرمایا ہو اور نور کو ظلمت سے واضح نہ کر دیا ہو۔ اس راہِ صواب سے وہی روگردان ہو سکتا ہے جس کے سر پر ہلاکت منڈلا رہی ہو، لیکن اگر کوئی شخص کسی شے کو "مصلحت" خیال کیے ہوئے ہے اگرچہ شرع میں اس کے متعلق کچھ وارد نہ ہو تو دو باتوں میں سے ایک بات ضرور ہے یا تو یہ کہ اس سلسلے میں شارع کی دلالت فرمودہ مصلحت اُس شخص کے علم میں نہیں ہے یا پھر وہ سِرے سے مصلحت ہی نہیں ہے جس کو وہ مصلحت سمجھ بیٹھا ہے کیونکہ منفعت وہی ہے جو حاصل یا غالب ہو اور اکثر ایسے لوگ ہیں جو اس خیال میں مبتلا ہیں کہ فلاں بات دین و دنیا میں نافع ہے حالانکہ اس میں منفعت سے مضرت زیادہ ہوتی ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے" یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر و منافع للناس واثمھما اکبر من نفعھما (البقرہ ۲۱۹) "پوچھتے ہیں شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے؟ کہو ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے۔ اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں، مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے" (تفہیم القرآن جلد ۱ ص ۱۶۷، از سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

(یہ بحث ڈاکٹر ابو زہرہ کی کتاب "حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ" (ص ۲۴ تا ۲۶)، ترجمہ غلام رسول مہر المکتبۃ السلفیہ

شیش محل روڈ لاہور سے ماخوذ ہے)۔
مصلحت کے سلسلے میں حسب ذیل امور پر سب کا اتفاق ہے۔
۱۔ شریعت کے تمام احکام مصالحت پر مبنی ہیں۔
۲۔ عبادات مثلاً وضو، تعداد صلوٰۃ و رکعات، ایام مخصوصہ میں صوم اور حج کی فرضیت یا بالفاظ دیگر مقادیر شرعیہ میں مصلحت مرسلہ بربنائے احکام کی گنجائش تو کیا قیاس تک کی گنجائش نہیں (الاعتصام جلد ۲ ص ۱۲۰)
۳۔ اگر کسی مصلحت کے اعتبار کی شہادت شریعت کی کسی اصل خاص سے ملتی ہو تو وہ مقبول ہے اور اگر کسی مصلحت کے عدم اعتبار کی شہادت کسی اصل شرعی سے ملتی ہو تو وہ مردود ہے۔ (اصول التشریع الاسلامی از علی حسب اللہ صفحہ ۱۴۵، دار المعارف مصر)

(باقی)

تصحیح

ستمبر کے شمارہ میں ص ۱۷ پر شہدا کے متعلق سورۂ بقرہ کی آیت وَلَا تَقُولُوا ...... لَا تَشْعُرُونَ میں یہ الفاظ زائد درج ہوتے ہیں: بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ یہ الفاظ سورۂ آل عمران کی آیت لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ .... الخ میں آتے ہیں۔

بحث و نظر

مولانا مودودی کا طریق انقلاب

جناب اسعد گیلانی صاحب

نومبر ۱۹۸۳ء کے رسالہ ترجمان القرآن میں " مولانا مودودی کا طریق انقلاب" کے عنوان سے ایک سوال شائع ہوا ہے اور اس کا آپ نے ایک جواب دیا ہے۔ سب سے پہلے تو اس بات کی مسرت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے ترجمان القرآن میں " طریق انقلاب" کے جداگانہ عنوان کے تحت یہ سوال و جواب شائع کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مولانا مودودیؒ کی دی ہوئی فکر و استدلال نے ہمیں اتنی سوجھ بوجھ ضرور دے دی ہے کہ ہم عقلی بنیاد پر چیزوں اور معاملات کا حسن و قبح پرکھ سکتے ہیں اور کسی غلط راستے کو اختیار کرنے والے نہیں ہیں۔ اس لیے ہمارے درمیان بدلتے ہوئے حالات میں مسائل پر بحث کرنے اور چھان پھٹک کر نتائج اخذ کرنے کی روایت قائم رہنی چاہیے۔ منجمد خیالات کے ساتھ پیش قدمی مشکل ہوتی ہے اور حوصلۂ اقدام کے بغیر کسی منزل پر پہنچنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے " طریق انقلاب" کی بحث کو کھلا رہنا چاہیے۔ اس سے کسی کے گمراہ ہونے کا خطرہ نہیں ہے۔ بلکہ بہت سے الجھے ہوئے ذہنوں کو یکسو ہونے کے مواقع اور دلائل فراہم ہوتے ہیں (مجھے بھی آپ کے اس خیال سے اتفاق ہے۔ ن۔ص)

سب سے پہلے میں اس سوال کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں جو کسی صاحب نے مرتب فرمایا ہے۔ سوال کرنے والے بزرگ نے میرا مضمون صحیح طور پر پڑھے بغیر سوال بنا دیا

ہے۔ انہوں نے اس خیال سے کہ مضمون کا عنوان "سید مودودی کے سیاسی فکر کے ۱۶ نکات"[۱]
ہے۔ (عنوان میں نے اس لیے بدلا کہ مکمل طور پر مولاناؒ کے سیاسی فکر کا احاطہ کرنے
کے لیے زیادہ جامع بحث کی ضرورت تھی۔ ن۔ص)۔ سولہویں نکتہ کے تمام مضمون کو مولانا
مودودیؒ کی سیاسی فکر کی حیثیت سے ہی پیش کر دیا گیا ہے۔ یہ دیکھے بغیر کہ مولانا مودودیؒ
کی سیاسی فکر کا نکتہ کہاں ختم ہوا ہے اور اس فکر کا ذکر ختم کر کے ایک دوسرا نکتہ کہاں سے
شروع کیا گیا ہے[۵]۔ جس "ذری سٹائل کشتی" کے تصور سے وہ سخت پریشان ہوتے ہیں
اس "عوامی انقلابی تحریک" کے متصل لکھا ہوا ہے کہ یہ طریقہ ایران نے اپنایا اور آزمایا
ہے اور اس کی کوئی تہمت لکھنے والے نے مولانا مودودی کے طریق انقلاب پر نہیں رکھی
ہے اور نہ ہی اسے مولانا مودودی کے طریق انقلاب کی حیثیت سے اس مضمون میں پیش
کیا گیا ہے[۲]۔ اس لیے سوال بنانے والے بزرگ نے اپنی ایک بات مضمون نگار کے منہ میں
ڈال کر زیادتی کی ہے۔ یہ حرکت کوئی دوسرا کرتا تو کوئی حرج نہیں تھا کہ اس فن کے ماہرین
کی ہمارے اہل علم طبقہ میں کوئی کمی نہیں ہے اور مولانا مودودیؒ تو ساری عمر اس حرکت کو بھگتتے

۱؎ یہ عنوان بھی آپ نے نامناسب طور پر رکھ دیا۔ میں نے اس کا عنوان مولانا مودودی کے سیاسی افکار
لکھا تھا۔ یہ عنوان زیادہ جامع تھا۔ (مؤلف مضمون)

۲؎ اگرچہ میری رائے یہی ہے کہ مولانا مودودی پاکستان کے حالات کی روشنی میں دستوری
انتخابی طریقے کے قائل تھے۔ ورنہ اسلامی انقلاب کے لیے وہ ہر ملک کے حالات کے مطابق
مختلف طریقوں کے قائل تھے۔ (مؤلف مضمون)

۵ دراصل مولانا مودودیؒ کی فکر کے نکتے کے سامنے ہی چونکہ تشریح اور استنتاج ملے جلے
ہیں اس لیے کوئی بھی شخص الجھ سکتا ہے۔ (ن۔ص)

رہے ہیں لیکن "جماعتِ اسلامی کے ایک دیرینہ کارکن" کو تو اس کا پورا احساس ہونا چاہیے تھا کہ قلم کی ذرا سی جنبش سے "ناممکن" "ممکن" کیوں کر بن جایا کرتا ہے اور اس کارروائی سے مضمون نگار کو کتنی ذہنی اذیت ہوا کرتی ہے۔ میں ان سے عرض کروں گا کہ وہ اپنا وہ مفہوم واپس لیں جو انہوں نے اپنے ذہن سے نکال کر میرے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اپنے اس مضمون میں یہ بات ہرگز نہیں کہی کہ مولانا مودودیؒ پاکستان میں بھی عوامی انقلابی تحریک کے ذریعے اسلامی انقلاب لانا چاہتے تھے۔ میں نے یہ کہا کہ عوامی انقلابی تحریک کا بھی ایک طریقہ ہے جسے ایران میں آزمایا گیا ہے۔ میں نے اسے جماعت اسلامی کے دستوری انتخابی طریقے یا مولانا مودودی کے پاکستانی طریقے کی حیثیت سے پیش نہیں کیا۔ جماعت اسلامی کے دیرینہ کارکن سائل نے اسے خواہ مخواہ الجھا دیا ہے۔

اب یہ بات کہ وہ کہاں تک قرآن و سنت کے مطابق یا مخالف ہے یہ ایک علیحدہ بحث ہے جس کے لیے ترجمان القرآن کے صفحات میں گنجائش ہو تو پھر علمی دلائل سے بات کی جا سکتی ہے اور یہ بھی بتایا جا سکتا ہے کہ خود مولانا مودودیؒ صاحب کس حد تک اس طریقہ کار کے مخالف یا موافق یا غیر جانب دار تھے۔ اور ان کے لٹریچر اور تصریحات سے کیا طریق کار ان کی فکر کے مطابق قرار پاتا ہے۔ وہ بحث جماعت اسلامی کے متعینہ دستوری طریق کار کو زیرِ بحث لائے بغیر علمی طور پر کی جا سکتی ہے۔ جماعتِ اسلامی کا طریقہ کار تو اس کے دستور میں موجود ہے جو یہاں زیرِ بحث نہیں۔ ظاہر ہے کہ مولانا مودودی کے سارے لٹریچر کو تو جماعت اسلامی کے دستور کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔

جہاں تک عوامی انقلابی تحریک کا تعلق ہے خود پی این اے کی تحریک بھی ایک عوامی انقلابی تحریک ہی تھی جس کے ذریعے ایک منتخب حکومت کو بلا انتخاب بدل دیا گیا تھا۔ انقلابی وہ اس لیے بن گئی تھی کہ اس کی مدد سے حکومت کو بدل دیا گیا اور عوامی اس لیے کہ عوام نے خود اس میں شرکت کر کے اسے مضبوط بنایا۔ محترم سائل کو اس سے وحشت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ عوام کی شرکت اور تشدد کے عدم استعمال سے P.N.A. کی تحریک بھی عوامی انقلابی تحریک تھی۔

مرتب کردہ سوال کے بعد اب اس کے جواب کے بارے میں مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ جس لب و لہجہ میں جواب دیا گیا ہے اُس میں یہ بات پہلے مرحلے میں ہی تسلیم کر لی گئی ہے کہ مضمون نگار نے کوئی بڑی ہی گناہ کی بات کہہ دی ہے۔ جس پر ایڈیٹر نے اپنی اس کوتاہی کے لیے کہ وہ اشاعت پذیر ہو گئی ہے" سچے جذبے سے اللہ تعالیٰ سے عفو طلب کیا ہے اور احباب سے درگزر کی عاجزانہ درخواست کی ہے △۔ عفو طلبی اور درگذر کی بات یوں تو ہر وقت ہو سکتی ہے، لیکن اس سیاق و سباق میں جس بات پر کی گئی ہے اس نے اس مضمون کو کافی حد تک معصیت آلود بنا دیا ہے جو حیران کن بھی ہے اور پریشان کن بھی۔ آخر کوئی شخص علمی سطح پہ یہ بات کہہ گزرے کہ اسلامی انقلاب کے لیے انتخابی دستوری طریقے کے علاوہ بھی کوئی طریقہ ہو سکتا ہے تو وہ کس طرح معصیت کی بات بن جاتی ہے۔ رسولِ اکرمؐ کا طریقِ انقلاب جیسے مولانا مودودیؒ نے اپنے مقالے" اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" میں بیان کیا ہے وہ لازماً انتخابی دستوری طریقہ نہیں تھا۔ اور اگر کوئی داعیٔ دعوتِ اسلامی کفار کی اکثریت کے ملک میں اپنے دعوتی کام کا آغاز کرے تو وہ ہرگز انتخابی طریقہ اختیار نہ کرے گا۔ خود ہندوستان میں جماعتِ اسلامی اس انتخابی طریقے سے اجتناب کرتی ہے۔ اگر کوئی داعی کسی آمرانہ طرزِ حکومت میں اُٹھے تو وہاں بھی اس کا طریقہ انتخابی نہ ہوگا۔ اور اس طرح ایک سے زائد مثالیں دی جا سکتی ہیں، جہاں دعوتِ اسلامی بھی ہو اور طریقہ انتخابی نہ ہو۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ کا طریق بھی انتخابی دستوری نہ تھا اس لیے کسی دوسرے طریقے کے ذکر پہ ہی استغفار کرکے

△ اس کی ضرورت خاص اس وجہ سے بھی محسوس ہوئی کہ "امام حسین علیہ السلام" کا شیعی شعار وہ اسلوب اختیار کیا گیا۔ میرا ذاتی اندازہ یہ تھا کہ آپ نے جس ادارے کے اسٹیج سے بات کہی تھی اس کی تالیفِ قلب کے لیے شاید یہ انداز استعمال کیا ہو تاکہ اپنی بات کو آپ اس حلقے میں زیادہ قابلِ نفوذ بنا سکیں۔ مگر مجھے بعض معترضین کے اعتراض کے بعد اس بارے میں ندامت ہوئی۔ اور پھر یہ تو کسی لمحۂ احساس کی کیفیتِ خاص ہوتی ہے جو ظاہر ہوتی ہے۔ غلطی اور گناہ میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے میں نے آپ کے کسی جذبہ سے تعرض نہیں کیا، میں تو صرف اپنی کیفیات کو بیان کر سکتا ہوں۔ (ا۔ ر ص)

اس معصیت سے اجتناب کی دعا کرنا کوئی لازمی امر نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس کے ذکر سے کسی بڑی آفت کے ٹوٹ پڑنے کا اندیشہ ہے اور نہ شرعاً یہ ذکر ممنوع ہے۔

جس طریقِ انقلاب کو میں نے مولانا مودودیؒ کا نہیں ایران کا طریقِ انقلاب ظاہر کر کے بات کی ہے اس کا جواب اور جواز محترم ایڈیٹر نے مولانا کی کتاب تفہیمات کا حوالہ دے کر خود ہی پیش کر دیا ہے اس لیے مجھے اس جوابی تحریر میں اس سے زائد کوئی حوالہ پیش کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ اگرچہ وہ طریق کار یہاں ہمارا نہیں ہے اور ہمارا طریقہ زیربحث بھی نہیں ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ کس الرجی+ کے تحت طریقِ انقلاب کی ایک بالکل علمی اور عمومی بات کو جماعت اسلامی کے دستوری انتخابی طریق انقلاب کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جماعتِ اسلامی انتخابی طریق کار کی حامل تنظیم ہے اور اس سے وابستہ لوگ اس کے پابند ہیں۔ خود میں بھی اس کا پابند ہوں۔ لیکن کیا جماعت اسلامی کے انتخابی طریق کار کی موجودگی میں اسلامی طریقِ انقلاب کے جو دیگر تمام ممکن طریقے ہو سکتے ہیں۔ اُن پر علمی بحث سے بھی جماعت اسلامی کے دستوری انتخابی طریق کار کو ضعف پہنچتا ہے یا علمی بات کرنے والے کے عمل کو نقصان پہنچتا ہے۔ مثلاً کیا میں حنفی ہوتے ہوئے یہ بات کہنے کا مجاز ہوں یا نہیں کہ شافعی مسلک میں فلاں مسئلہ یوں ہے اور حنبلی مسلک میں فلاں مسئلہ یوں ہے۔ کیا اس اظہارِ خیال سے بھی کسی شخص کا خود حنفی ہونا مشتبہ یا خود مسلکِ حنفیت کا نقصان ہے۔ مجھے رنج ہوا ہے کہ ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ ماحول میں اس نوعیت کی سطحی سوچ# کیوں پرورش پا گئی ہے۔ مولانا

+ میرا خیال ہے کہ ایسے الفاظ اگر ہر طرف سے استعمال ہونے لگیں اور دنیائے ادب میں کسی بھی طرح کے لفظوں کی کمی نہیں ہے تو پھر اختلاف کے وجہ رحمت بننے میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ (ن - ص)

ہم اپنے رفقا کے اختلافات اور اعتراضات سن کر انہیں سطحی سوچ میں مبتلا ہونے کا طعنہ دینے کے بجائے ٹھنڈے دل سے انہیں تسکین بخش جواب دیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ (ن - ص)

مودودیؒ تو مسائل پر اس انداز میں غور نہیں کیا کرتے تھے۔ وہ تو تحقیق و تفتیش اور بحث و استدلال کے ذریعے اپنے اور دوسروں کے موقف بلا تکلف بیان کرتے اور اپنے موقف کے حق میں دلائل دیا کرتے تھے۔ تبلیغ و تعلیم و تربیت و توسیع و تنظیم کے تمام مراحل سے کون انکار کرتا ہے۔ اس کے بغیر کوئی شخص کیسے کوئی تحریک اٹھا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر تحریک اِن مراحل سے گذر کر ہی کسی تبدیلی کو رُو نما کرنے کی قوت حاصل کرتی ہے۔ ایک غیر اسلامی تحریک کو بھی اپنے انداز فکر کے مطابق ان مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ ابتدائی مراحل صرف اسلامی تحریک سے ہی وابستہ نہیں ہیں۔ مسئلہ تو اس قوت کے حصول کے ذریعے تبدیلی رُو نما کرنے کا ہے۔ تو اس کے متعدد طریقے ہو سکتے ہیں۔ ہم نے اس کے لیے انتخابی دستوری طریقہ اپنایا ہوا ہے۔ یہی ہماری مصلحت اور حالات کے مطابق ضرورت ہے۔ ہم اسی کے پابند ہیں۔ لیکن یہ واحد، آخری اور حتمی طریقہ نہیں ہے۔ اسی کے اندر حق کو محصور اور محدود سمجھنا کوتاہ نظری ہے۔[1]

میں آپ کو پھر مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ نے اس بحث کے لیے ترجمان کے صفحات کا دروازہ کھولا ہے۔ شکریہ۔ اگر آپ اس خط کو شائع کر کے طریق انقلاب کی بحث کو علمی سطح پر پھیلائیں تو اسلامی ادب میں ایک بہت بڑی اجتماعی خدمت ہوگی جس کی ضرورت کا احساس لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ والسلام۔

---

(۲)
از جناب جاوید اکبر انصاری صاحب

محترم اسعد گیلانی صاحب کے اکتوبر کے مضمون پر جناب نعیم صدیقی صاحب کے اعتراضات نظر سے گذرے۔ آپ سے گذارش ہے کہ مندرجہ ذیل مختصر تبصرہ کو ترجمان القرآن کے

---

[1] آپ کی یہ تصریحات بہت اچھی ہیں اور مغالطے دُور کرنے میں ممد ہوں گی۔ (ن ص)

صفحات میں جگہ دیں۔

۱۔ اللہ کا فضل ہے کہ ترجمان القرآن کے صفحات میں آج ایک مدت کے بعد ایک ایسے اہم موضوع پر بحث کا آغاز ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تحریک کی ترقی کا انحصار کسی حد تک اس بات پر بھی ہے کہ ہم انقلاب کے طریقہ کار کے بارے میں کیا رائے قائم کرتے ہیں۔ اس ضمن میں یکسو ہوئے بغیر کام کو آگے لے جانا بہت دشوار نظر آتا ہے۔

۲۔ بحث کا محور اور مرکز مولانا مودودیؒ کی تحریرات ہیں۔ بحث کو اس طرح شروع کرنے میں ایک خطرہ یہ ہے کہ ہم نادانستہ طور پر مولانا مودودیؒ کی تحریرات کو واحد معیارِ حق تسلیم کر لیتے ہیں اور غیر شعوری طور پر دیگر علماء کی آراء کو صرف اس لیے نظر انداز کر دیتے ہیں کہ مولانا مودودیؒ ان آراء سے متفق نظر نہیں آتے۔ میری رائے میں زیادہ بہتر یہ ہے کہ بحث کے فریق قرآن اور سنت اور دیگر مآخذ سے براہ راست رجوع کر کے اپنی بات ثابت کریں۔ اور مولانا مودودی اور دیگر علماء کی تصانیف سے قرآن اور سنّت کو سمجھنے کے لیے مدد لیں، لیکن یہ نہ ہو کہ تحریکِ اسلامی مولانا مودودی کی تحریرات کو بنیادی مآخذ کا درجہ دے دے اور کبھی کوئی ایسی پوزیشن اختیار نہ کرے جو شرعاً جائز ہو، لیکن جس سے مولانا مودودیؒ متفق نہ تھے۔ خود مولانا مودودیؒ نے کبھی کسی دوسرے عالم کی رائے کو اس نوعیت کی اہمیت نہیں دی۔

۳۔ بحث جمہوری اور غیر جمہوری طریق انقلاب کے بارے میں ہے۔ مولانا نعیم صدیقی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مولانا مودودیؒ خصوصی حالات میں UNDER EXCEPTIONAL CIRCUMSTANCES) غیر انتخابی اور غیر جمہوری طریقے سے اسلامی انقلاب کے قیام کو شرعاً ناجائز نہیں سمجھتے تھے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ کون سے حالات ہیں، جن کو "خصوصی" قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور جن میں غیر جمہوری اور غیر انتخابی طریق انقلاب اختیار کیا جا سکتا ہے۔ میری رائے میں پاکستان میں ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک حالات کبھی "معمول" پر نہیں آئے۔ اور ہمیشہ "خصوصی" ہی رہے ہیں۔ اور جیسے جیسے وقت گذرتا جا رہا ہے، حالات کے "معمول" پر آنے کی اُمید کم سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ چنانچہ تمام

سیاسی تبدیلیاں غیر جمہوری طریقے ہی سے آئی ہیں۔ جب تک امریکہ اور سوویت روس کو ہمارے ملک پر بالادستی حاصل رہے گی اور جب تک ہماری فوج اور سول سروس غیرجمہوری طور پر منظم ہوتی رہے گی، حالات کے "معمول" پر آنے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔

۴ --- اِن حالات میں تعلیم اور اشاعت کا تنظیم اور کشمکش سے جو تعلق ہوتا ہے، وہ جمہوری اور انتخابی نہیں ہوسکتا۔ اِس معاشرہ میں "آئین اور قانون" کا عملاً نفاذ ناممکن ہوتا ہے۔ حکمران جو قانون اور جو آئین جب چاہتے ہیں بنا دیتے ہیں جب چاہتے ہیں اُس کو رد کر دیتے ہیں۔ اِن حالات میں "آئینی اور قانونی" جدوجہد حکومتی نظام میں تبدیلی نہیں لا سکتی اور اِن حالات میں انقلابی جماعتیں اس بات پر مجبور ہوتی ہیں کہ اپنے تبلیغی کام اس نوعیت سے منظم کریں کہ اُن کے کارکن معاشرتی طور پر با اثر اور با اختیار ہوتے چلے جائیں اور ایک ایسا وقت آئے کہ قائم شدہ نظام کو چلانا ممکن نہ رہے۔ ۱۹۷۷ء کی تحریک نے واضح کر دیا ہے کہ پاکستان کے "خصوصی" حالات میں اسلامی انقلاب کی راہ کیا ہے۔

۵ --- ایک اسلامی انقلابی جماعت کے عام کارکن کو معاشرتی سطح پر با اثر اور طاقت ور بنانا ان "خصوصی" حالات میں ناگزیر ہے۔ اس ملک کا "قانون" اور "آئین" ہمیں کبھی اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے۔ تحریک کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اپنے معاشرتی اثر کو بڑھانے کے لیے جو ذرائع اختیار کرے وہ شرعاً جائز اور احسن ہوں اور اسلامی حکومت کے قیام کے بعد اس بات کی کوشش کرنا چاہیے کہ حالات معمول پر آجائیں۔

---

(۳)

جناب نعیم صدیقی صاحب

ہر دو بحثوں کو پڑھنے کے بعد میرا خیال یہ ہے کہ دو الگ الگ دائرہ ہائے گفتگو ہیں۔ ایک یہ کہ مولانا مودودیؒ کا سوچا ہوا طریق انقلاب کیا تھا؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے وسیع لٹریچر بھی موجود ہے، کیے ہوئے کام کی تاریخ بھی ہے۔ اور کاروانِ انقلاب کے بزرگ اور نوجوان ہم سفر بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ دوسرا یہ کہ ہم میں سے کسی کی نظر میں

اسلامی انقلاب کا تکمیلی عمل کیسے واقع ہوگا یا ہونا چاہیے۔ پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ نے تکمیلی عمل کو اس لیے مبہم چھوڑا ہے کہ اس کی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں، شاید ایسی بھی جو ہمارے تصور میں نہ ہوں، کیونکہ واقعات کی گردشیں ایسے ایسے عجیب تاریخی لمحات پیدا کر دیتی ہیں کہ جن کا پہلے سے کوئی تفصیلی تصور موجود نہیں ہوتا۔ رہا دوسرا سوال، سو فکری نظری سطح پر ہمارے سوچنے والوں کو ہر قسم کے ممکنات پر غور کرتے رہنا چاہیے۔

مثلاً اب تک دُنیا میں انقلاب کی ایک شکل سازش و بغاوت کے انداز کی معروف رہی ہے، خواہ وہ سول راستے سے ہو یا فوجی راستے سے، ایک شکل وہ ہے جس کا تجربہ یہاں بھی متحدہ محاذ نے عظیم ایجی ٹیشن سے کیا اور اس کا طرز یہ تھا کہ ایک مقصد کے لیے اتنی زیادہ قربانیاں بغیر پسپائی کے دی جائیں کہ عوام کی مظلومی خود ایک فیصلہ کن قوت بن جائے۔ بعض وجوہ سے اس کوشش کا منفی نتیجہ تو حاصل ہو گیا کہ ایک ظالم حکومت کی بساط اُلٹ گئی، مگر مثبت طور پر فوج سامنے آگئی۔ جس کے بعد متحدہ محاذ کا بکھر جانا اس بات کا ثبوت بنا کہ انقلاب کے لیے مطلوبہ وحدت موجود نہ تھی۔ یہی تجربہ ذرا مختلف حالات میں ایران میں کیا گیا اور اس کے نتیجے میں تبدیلی واقع ہو گئی۔

ایک تجربہ وہ ہے جو اہل افغانستان ایک سپر پاور کے مقابلے میں اختیار کیے ہوئے ہیں، مگر وہ ابھی آخری منزل تک نہیں پہنچا۔

ادھر سوڈان میں اسلامی قوتوں نے انقلاب کا ایک اور طریقہ آزمایا ہے کہ وہاں کے حکمران کی تبدیلیٔ ذہن کے ساتھ حکومت کے تمام شعبوں میں اسلامی عناصر نے نفوذ کر کے اقتدار کے تعاون سے نفاذِ شریعت کا مؤثر اور تیز رفتار آغاز کیا ہے۔ یہ تجربہ بھی ایسا ہے کہ ہم اس کی کامیابی کی دعاؤں کے ساتھ تکمیلی مرحلے تک اس کی پوری کشاکش کو دیکھنے کے ضرورت مند ہیں۔

ایک تجربہ تاریخ میں وہ تھا کہ بنو امیہ کے شاہی خاندان سے اقتدار ایک مرد صالح حضرت عمر بن عبدالعزیز کی طرف منتقل ہو گیا، جن کی سابق زندگی اموی شہزادوں کی مانند تھی اور کوئی خطرناک جراثیم اموی خاندان کو دکھائی نہیں دیتے تھے۔ مگر سلطنت کو سنبھالتے ہی وہ شخص صحابہ کرام کی مانند یکسر درویش بن گیا اور اس نے انقلابی جذبے سے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ

نقشۂ احوال کو کتاب وسنت کے مطابق ایسا بدلا کہ مورخین اسے پانچواں خلیفۂ راشد بھی شمار کرتے ہیں۔

میرا کہنا یہ ہے کہ وہ مقام جہاں پہنچ کر ذی شعور انقلابیوں کا گروہ تکمیلی مرحلے کی طرف قدم بڑھاتا ہے اس سے پہلے کے لیے مولینا مودودیؒ نے کام کا جو نقشہ دیا تھا وہ اب تک نامکمل ہے۔ اور بہم شدہ قوت محدود ہے۔ وہ نقشہ جو اساسی دعوت (اور اب تو یہ اساسی دعوت ثانوی درجے میں چلی گئی ہے۔ کیونکہ سیاسی کشاکش کے تجربوں کی اہمیت بڑھ گئی ہے) رابطۂ عام اور ہر دائرے میں اثر اندازی پر مشتمل تھا۔ اس کے تقاضے تو ہمیں پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ہم پر بھرپور توجہ دو اور مسابقت کرنے والی بھاری قوتوں کی رفتار کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے نکلو۔ اس پکار کو تو ہم کما حقہٗ سن نہیں رہے، بلکہ ہماری دلچسپی تکمیلی مرحلۂ انقلاب کی شکل طے کرنے سے وابستہ ہو رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تھوڑی سی ایسی فکر کاوش کے ہونے میں ہرج نہیں لیکن اگر تکمیلی مرحلۂ انقلاب پر زیادہ توجہ صرف ہونے لگی تو یہ متذکرہ موجودہ فرض سے فرار کی ایک صورت ہوگی۔

فی الحال ہمارا ہدف یہ ہے کہ ہم اتنی قوت سمیٹ لیں اور وہ فرائض ادا کر لیں جو ہمیں اس چوراہے تک پہنچا دیں جہاں سے انقلاب کے تکمیلی عمل کے لیے مختلف راہیں پھوٹتی ہیں، جن میں بعض کو ہم جانتے ہیں اور بعض کو نہیں جانتے اور نہ یہی واضح ہے کہ اس وقت کیا حالات ہوں گے جن میں کسی خاص سمت میں قدم بڑھانا ہوگا۔

فی الحال اس بحث کو اس شمارے میں ختم کیا جا رہا ہے۔ بعد میں اگر مثبت خطوط پر لکھا ہوا کوئی ٹھوس مقالہ اس موضوع پر موصول ہوا تو شاید اسے شائع کیا جائے، مگر خیال رہے کہ ترجمان القرآن مثبت دعوت اور علمی مقالات پیش کرتا ہے، ایسی بحثیں نہیں کہ جواب اور جواب الجواب کا سلسلہ چلے اور قارئینِ کرام انتشار کا شکار رہیں۔ (ادارہ)

مطبوعات

ایک مسافر، چار ملک | از جناب حکیم محمد سعید صاحب ۔ ناشر: ہمدرد اکیڈیمی، ہمدرد فاؤنڈیشن ہمدرد سنٹر۔ کراچی نمبر ۱۰ ۔ ضخامت ساڑھے پانچ سو صفحات ۔ سفید کاغذ پر ٹائپ سے طبع شدہ ۔ جلد مضبوط ۔ رنگین گرد پوش ۔ قیمت /۶۰ روپے

حکیم محمد سعید پاکستان میں اپنی گوناگوں تعمیری سرگرمیوں اور خدماتِ دین و دانش کے لحاظ سے ایک منفرد شخصیت ہیں۔ ان کی پوری زندگی میں سفر ہی سفر کا غلبہ ہے "قیام" کم ہے۔ "شام ہمدرد" کے سلسلے میں ایک سفر تو اندرونِ ملک ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ پھر وہ ملکوں ملکوں میں مختلف ملی، علمی یا طبی خدمات کے لیے گھومتے رہتے ہیں۔ پیشِ نظر کتاب ہیں چار ملکوں یعنی آسٹریلیا، فرانس، سوئٹزرلینڈ اور انگلستان کی سیاحی کا دلچسپ بیان ہے۔ حکیم صاحب کے اس سفرنامے کی ایک خوبی تو یہ ہے کہ سلاستِ زبان، پاکیزگیٔ بیان، ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کاغذی صحرا میں جادہ پیما ہیں۔ نہ کہیں تاک جھانک، نہ جنسی نکات کی "چیونگ گم" سے دلچسپی، نہ بیکار کی فقرہ بازی، اس کے باوجود ساری داستان دلچسپ۔ اس سفرنامے کے آغاز میں اور اوراق کے اندر اگر حکیم صاحب اور ہمدرد فاؤنڈیشن کا ذکر نہ بھی ہو تو بھی پڑھنے والا جان لیتا ہے کہ یہ کسی "طبیب" کا سفرنامہ ہے۔ بلکہ حکیم صاحب کی روزنامچہ نویسی میں کئی مقامات پر "خود نوشت" کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ جس کا فائدہ یہ ہے کہ حکیم صاحب کی بے شمار خوبیاں سامنے آجاتی ہیں۔ کہیں کہیں تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ حکیم صاحب اپنی شخصیت کو تحریر کا اہم ترین موضوع گردانتے ہیں۔ سفروں کے اکثر سنگِ میل علمی ہیں، اور سلسلہ گفتگو میں حکیم صاحب قومی اور انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بڑی دلچسپ معلومات

پڑھنے والے کو دیتے ہیں - ایک جگہ یہ کمزوری محسوس ہوئی کہ ایک کانفرنس میں پاکستانی وفد کی عدم شرکت اور بعض سفارت کاروں سے توقعات پوری نہ ہونے کے احساس کو حکیم صاحب بار بار اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ خواہ مخواہ آپ کی عمر کچھ زیادہ معلوم ہونے لگتی ہے۔

عام ادبی سفرناموں میں بھی سیاسی کدورتوں کا اظہار اچھا نہیں ہوتا - لیکن بڑے آدمیوں کے علمی سفرناموں کو تو ایسی چیزیں بہت بدنما کر دیتی ہیں۔ مثلاً ص ۴۵، ۴۶ پر جماعت اسلامی پر خوب برسے ہیں - اور بات چھڑتی ہے جماعت اسلامی ہند کے خلافِ قانون قرار پانے پر۔ فرماتے ہیں کہ بھٹو صاحب کو جماعت برسرِ اقتدار لائی - اور پھر بڑا طعنہ یہ کہ جماعتِ اسلامی نئی حکومتِ "حق" میں داخل ہوئی مگر اقتدار میں رہ کر اس کی ناکامیوں کا اعتراف خود اس کے اپنے رہنماؤں کو بھی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ معاملہ ایک جماعتِ اسلامی ہی کا نہ تھا، یہ تجربہ اوروں نے بھی کیا - خود حکیم صاحب کا اپنا تجربہ بالکل ویسا ہی ہے - دو تین صفحے پہلے لکھتے ہیں کہ:

> "شاید میرے لیے یہ ممکن نہ ہو کہ میں بہ حیثیت مشیرِ صدرِ مملکت برائے طب زیادہ عرصے تک کام کرتا رہوں - میرے مزاج اور طب کے خلاف کام ہو رہے ہیں - بعض غلط لوگوں سے واسطہ پڑا ہے - اب ان کی زیادتیوں کی انتہا ہو چکی ہے۔" (ص ۴۲)

پھر بیوروکریسی کے متعلق بڑے تلخ تجربے کا ذکر ص ۱۰۱ پر بھی ہے۔ چنانچہ حکیم صاحب "مقامِ مشیری" کو چھوڑ آئے۔

بڑی مشکل صورت یہ ہے کہ سیاست دان تو غلط کرے یا صحیح وہ میدانِ سیاست میں موجود رہ کر پبلک اور ذہین ناقدین کا سامنا کرتا ہے - لیکن اگر کوئی علمی و سماجی شخصیت تھوڑی دیر کے لیے انتخابی سیاست میں آ نکلے اور پھر لوٹ کر علمی و سماجی خدمت کے جزیرے میں جا پناہ لے تو اس پر کوئی کیا گرفت کرے - حکیم صاحب اسلامی جمعیت طلبہ پر بھی برسے ہیں اور ایک "اسلامی اخبار" پر بھی - معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ انتخابات میں جماعت نے آن کا جھنڈا نہ اٹھا کر جو غلطی کی تھی، سلسلہ کچھ اسی کی تعزیر کا ہے -

انتہا یہ کہ سڈنی میں بھی جماعت اسلامی کے تصور کا کانٹا اپنی چبھن دکھاتا رہا۔ (ص ۵۱۸)
وہاں ایک سہ روزہ مسلم کانفرنس ہو رہی تھی۔ حکیم صاحب جو کہ پاکستان کی ایک نمایاں شخصیت تھے اس لیے کانفرنس والوں نے اُن سے اصرار کیا کہ وہ افتتاحی تقریر کریں۔ حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اصرار کیوں ہے؟ آخر ایک صاحب نے حکیم صاحب کے کان میں راز کی بات کہہ دی کہ مدعا یہ ہے کہ کانفرنس (بہ سلسلہ ۱۵ ویں صدی تقریبات) کے حسابات سعودی عرب میں بھجوا کر وہاں سے رقم وصول کی جا سکے اور آپ کا تعلق اس گرہ کشائی میں آسانی پیدا کر دے گا۔ حالانکہ اگر وہ کانفرنس جماعتِ اسلامی سے متعلق ہوتی تو اوّل تو وہ لوگ بہ آسانی اپنی اپنی طرف سے ایثار کر کے مصارف پورے کر لیتے اور اگر سعودی عرب ہی میں انہیں دامن پھیلانا ہوتا تو حکیم صاحب سے زیادہ بااثر ذرائع ان کو مہیا ہو سکتے تھے۔
ایک طرف تو یہ صورت، اور دوسری طرف یہی حکیم صاحب پروفیسر جعفری صاحب کے لیے جدہ سے ۲۵ ہزار ڈالر کی امدادی رقم دلواتے ہیں۔ اور یہاں نہ پروفیسر جعفری صاحب مجرم معلوم ہوتے ہیں، نہ حکیم صاحب میں کوئی اثرِ گناہ محسوس ہوتا ہے۔ (۵۲۵)
یہ چند چیزیں ہیں جو "جملہ معترضہ" کے طور پر اس لیے نشان زد کی ہیں کہ اتنے اچھے علمی و ادبی سفرنامے اور حکیم صاحب جیسی نستعلیق شخصیت کے ساتھ یہ چیزیں زیب نہیں دیتیں۔

اسی طرح افغانی مہاجرین کے متعلق صفحہ بھر کا جو مواد انہوں نے شامل کتاب کیا ہے، بہت تکلیف دہ ہے۔ یہ کہنا کہ "افغان مہاجرین کے پاس بے پناہ دولت ہے"! "پشاور شہر میں غذائی مسئلہ پیدا ہو گیا ہے"، "روسی سکہ کا لین دین عام ہو رہا ہے" ۔ اور پھر "خطرہ انقلاب" (ص ۴۷۶) ایسے ریمارکس ہیں کہ آدمی کچھ حیران ہوتا ہے، کچھ پریشان!
حکیم صاحب نے آسٹریلیا کی ایک بہت ہی اہم صورتِ واقعہ کو نمایاں کر کے ملت کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ قطع نظر اس افسوسناک انکشاف کے کہ انہوں نے کھانے کی ایک محفل میں حلال سے زیادہ حرام کی رغبت کا نظارہ کیا۔ اس حقیقت کو بھی انہوں نے عالمِ اسلام کے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے کہ آسٹریلیا سے جو گوشت مسلمان اکابر (اسلامیات میں پی ایچ ڈی حضرات)

کی طرف سے ذبیحہ ہونے کی تصدیقی مُہریں لگوا کر برآمد کیا جاتا ہے، وہ ذبیحہ نہیں ہوتا بلکہ جھٹکے کے عمل سے جانوروں کو کاٹ کر ان پر ذبیحہ کی مہریں لگوائی جاتی ہیں۔ مُہردار حضرات کا پوری کارروائی سے کوئی مطلب اس کے سوا نہیں ہوتا کہ وہ اپنی فیس (غالباً گوڈالر فی ذبح) وصول کر لیتے ہیں۔ یہ غیر حلال "ذبیحہ" سعودی عرب اور مشرق وسطیٰ کے دوسرے مسلم ممالک میں جاتا ہے۔ اور مسلمانوں کے دسترخوانوں کی زینت بنتا ہے (ص ۵۱۶ - ۵۱۷)

اس انکشافِ حقیقت کی جزا اللہ تعالیٰ حکیم صاحب کو دے۔ کاش کہ مسلمان حکومتیں خود اپنے آدمی بھیج کر تحقیق و تفتیش کرائیں اور حرام گوشت سے اپنی آبادیوں کو بچائیں۔

حکیم محمد سعید صاحب کی اس کتاب میں بہت سی مفید معلومات ہیں۔ بہت سے اخلاق و آداب کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، بہت سے طبی نکات بیان ہوئے ہیں اور جا بجا دینی تعلیمات بھی خوبصورت انداز میں مذکور ہیں، حتیٰ کہ صلوٰۃ تسبیح تک کی تفصیل درج ہے۔

ہماری خواہش ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے پڑھیں اور استفادہ کریں۔

MUSLIM CROSS WORD PUZZLES

مؤلف: ارشد گیمیٹ (ARSHAD GAMIET)

ناشر: اسلامک فاؤنڈیشن، ۲۲۳ لندن روڈ لائسسٹر۔ یو کے۔ اعلیٰ کاغذ اور خوبصورت انگریزی ٹائپ۔

قیمت نامعلوم۔

"اسلامک فاؤنڈیشن" یورپ میں مسلمان بچوں کو انگریزی سیکھنے کے لیے ایسی کتابیں فراہم کر رہی ہے کہ ظاہراً وہاں کے ذوق اور مروجات کے مطابق بھی ہوں، اور بلحاظ روح اسلامی بھی۔ کراس ورڈ معموں کی یہ انگریزی کتاب اپنی جگہ ایک اچھی مثال ہے۔ یہاں کے اہلِ ذوق بھی اپنے بچوں اور اسکولوں کے لیے طلب کریں۔

(بقیہ اشارات) ہوتا ہے۔ فرماں روا سیاسی جماعت کے لیڈر اور کارکن پہلے سے اس کے لیے فضا بنانے لگتے ہیں۔ اور اعتراضات کو صاف کر دیتے ہیں۔

۸ ۔ سیاسی جماعتیں اپنے ہزارہا کارکنوں کی ٹیموں کے ذریعے ملک بھر کے تمام علاقوں اور بستیوں کے حالات کی رپورٹیں آسانی سے جمع کر لیتی ہیں۔ پھر ان معلومات کی بنیاد پر معاملات کو صحیح طور پر سمجھنا اور فیصلے کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

۹ ۔ سیاسی جماعتوں سے کارکنوں کی وابستگی ہی اُن کو مختلف اُمیدواروں کی رشوتیں قبول کرنے سے روکتی ہے۔ اور وہ اپنی پارٹی کا جھنڈا بلند رکھنے کے لیے پاس سے خرچ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ یقیناً اس تعریف سے مستثنیٰ تعداد بھی موجود رہتی ہے۔ مگر وہ اس وجہ سے ہے کہ نہ تو انتخابی تربیت پوری طرح ملی ہے اور نہ بدعنوانیوں کے خاتمے کے لیے بھرپور قانونی کارروائیاں ہوتی رہی ہیں۔

اِن حقائق کو سامنے رکھیں تو غیر جماعتی انتخابات کا تصور بھی نہ لائیں۔ غیر جماعتی انتخابات جن میں فرد فرد الگ الگ ہوگا، ایک تو چھوٹے چھوٹے دائروں کی عصبیتیں زیادہ کام کریں گی، نظریۂ پاکستان اور اسلامی خدمات درمیان میں سے غائب ہو جائیں گے، ووٹروں کے ضمیر رشوت کے زہر سے مُردہ ہو جائیں گے۔ کسی اُمیدوار اور ووٹر کے سامنے کوئی ملک گیر مقصد نہ ہوگا کوئی اسلامی نصب العین نہ ہوگا، ہماری وحدت کے تمام قیمتی بندھن ٹوٹ جائیں گے۔

پس فیصلہ یہ ہونا چاہیے کہ انتخابات ہوں گے، جلد ہوں گے، جداگانہ ہوں گے اور جماعتوں کے ذریعے ہوں گے۔

"سیاسی جماعتوں" کے بارے میں ہمارے بزرگ و دانشور خادم ملت مولانا ظفر احمد انصاری کی چیئرمینی میں کام کرنے والے انصاری کمیشن میں جو منفی رپورٹ شریعت کے نام سے دی ہے اُسے اگر اجتہاد بھی کہا جائے تو بڑا اناہ گُن اجتہاد ہے۔ اس مبحث پر دو بہت اچھے مقالات روزنامہ جسارت میں آچکے ہیں، ایک مولانا محمد ناظم ندوی کا، دوسرا جناب صلاح الدین صاحب کا۔

تمام ضروری باتیں مدلّل طور پر ان میں بیان ہوگئی ہیں۔ ان کے ملخص کے طور پر ہی میں یہاں چند اجمالی نکات عرض کر رہا ہوں۔

۱۔ اوّلین امر جو نگاہوں سے مکمل طور پر اوجھل رہا ہے وہ یہ ہے کہ قرونِ اولیٰ کی مسلم سوسائٹی (خصوصاً عہد سعادت) آج اس شکل میں موجود نہیں، بلکہ ایک زوال زدہ معاشرہ ہمارے سامنے ہے۔ وہاں فرد فرد کو پہلے دن سے حقیقت دین و سیاست کا درس دیا گیا اور بیچ میں مسلسل اخلاقی شعور اس میں پیدا کیا گیا۔ ایسے افراد اپنا انتظام جس طور پہ بھی چلائیں وہ اچھے نتائج کے ساتھ چلنا چاہیے اور چلا۔ دوسرے اس اسلامی معاشرہ کو خدا کے رسولؐ کی قیادت حاصل تھی جس پہ سو فیصد ایمان و اعتماد ہر فرد کو تھا۔ تیسرے وہ معاشرہ ایک مختصر آبادی کی منظم طاقت سے وجود میں آیا تھا۔ جب کہ آج کروڑوں افراد پہ ایک ایک قوم مشتمل ہے۔ چوتھے یہ کہ وہ لوگ ایک ایسی انقلابی کشاکش سے گذرے اور مسلسل گذرتے رہے۔ جس نے ان کے اندر سے ان کے صحیح لیڈروں کو خود ہی ابھار دیا تھا۔ پانچویں یہ کہ وہاں کی مسلم آبادی قبائلی وحدتوں میں منظم تھی اور قبیلوں کے متعلق فیصلے اور معاہدات سردارانِ قبائل ہی کر لیتے تھے۔ آج یہ تنظیمی یونٹ موجود نہیں ہے۔ اس کا خلا کس طرح پورا ہوگا۔

آج جس معاشرے میں یہ سارے احوال نہ ہوں اس میں کام چلانے کے لیے کچھ دوسری (جائز) تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں۔ اجتہادات اس معاشرے کو سامنے رکھ کر کیجیے نہ کہ دَورِ سعادت کے معاشرے کے لحاظ سے۔

۲۔ آپ نے یہ تو فرمایا کہ سیاسی جماعتیں نہ ہونی چاہئیں کیونکہ پوری ملت ایک جماعت ہے۔ عرض یہ ہے کہ عملاً اس ملت کو ایک ملت کی حیثیت سے سامنے لا کے دکھایئے۔ پاکستان کو تو چھوڑیئے، کیا صرف کراچی کو آپ ایک منظم یونٹ بنا سکتے ہیں۔ پس جب یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ پوری ملت ایک منظم جماعت ہے تو اس بنیاد پر جو اجتہاد کھڑا کیا جائے گا وہ کیسے درست ہوسکتا ہے۔

۳۔ آج ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں، اس میں بھی بہت سے منظم گروہ ہیں۔ پیپلز پارٹی

ایک منظم جماعت ہے، مغرب زدہ خواتین کی تنظیمیں اپنا کام کر رہی ہیں، سیکولر نقطہ نظر کے لوگ اپنی حلقہ بندیاں رکھتے ہیں، ادب کی تنظیمیں ہیں، صحافت کی ہیں، مزدوروں کی یونینز ہیں، وکلا کی انجمنیں ہیں، ایوان ہائے تجارت ہیں، مذہبی طور پر خانقاہی نظام بھی ہے، پیری مریدی کی تنظیمیں بھی ہیں، تبلیغی جماعت کا نظام بھی ہے، منکرینِ حدیث کا ادارہ بھی ہے۔ قرآن کے لیے کام کرنے والے منظم حلقے بھی ہیں، دیوبندی اور بریلوی اور وہابی اور شیعہ تنظیمیں بھی ہیں۔ اگر یہ ساری جماعت بندیاں وحدت ملت کے اصول کے باوجود برسرعمل ہیں تو آخر ایک سیاسی ضرورت ہی سے تنظیم بندی کیوں ناجائز ہے۔

۴ ــــ آپ کہتے ہیں کہ سیاسی جماعتوں کے میدان انتخابات میں آنے سے بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مگر آپ نے یہ نہیں سوچا کہ جب آپ ہر ہر فرد کو ایک الگ جماعت (قائم مقام) بنا دیں گے، تو پھر خرابیاں کس درجہ کی ہوں گی۔ ہر خیال اور ہر فکر اور ہر رنگ کے افراد کو جب آپ چھوٹ دے دیں گے تو الیکشن افسروں کے لیے بھی اور ووٹروں کے لیے بھی اُن کو جاننا سمجھنا مشکل ہو جائے گا۔ اب تو لوگ آسانی سے اندازہ کر لیتے ہیں کہ فلاں آدمی مسلم لیگ کا ہے تو وہ اِس اِس طرزِ فکر کا ہوگا، جمعیت العلماء کا ہے تو ایسا ایسا ہوگا، تحریکِ استقلال یا این اے پی سے متعلق ہے تو اس کے خیالات و مقاصد فلاں فلاں ہوں گے۔ پیپلز پارٹی کا ہے تو اس کا فسطائی ذہن یوں یوں کام کرتا ہوگا، جماعتِ اسلامی کا ہے تو اس کے خیالات اور اس کا پروگرام اِس اِس انداز کے ہوں گے۔

آپ اگر سب کو فرد فرد کر کے انتخابی "پریشر ککر" میں اکٹھا ہی ڈال دیں گے تو ووٹنگ کی آنچ سے پک پکا کر نکلے گا کیا؟

۵ ــــ ہم اپنے محترم بزرگ اور اُن کے کمیشن کے ارکان سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ ہمارے اس نقطۂ نظر کو سمجھیں کہ ایک معاشرہ جس کا دَورِ زوال اور دَورِ غلامی کے بعد وحدتِ ملت کا (عقیدتی، عملی اور اخلاقی) بندھن ٹوٹا ہوا ہو، اُسے منظم ملت بنانے کے لیے اور کوئی راستہ ہی اس کے سوا نہیں ہے کہ جس خدا کے بندے کو صلاحیت و توفیق اللہ نے دی ہے، وہ دین کے اصولوں اور پاکیزہ سیاست کے شعور پر ایک ایک فرد کو جمع کرے اور آہستہ آہستہ اس کوشش

کو توسیع ملے۔ کوئی دوسرا شخص نیک نیتی سے اگر کسی دوسرے طریق کار کو بہتر سمجھتا ہو تو وہ جماعت بندی کرے۔ اس طرح کی جماعت بندیوں میں سے بعض ختم ہو جائیں گی، بعض متوازی طور پر کام کریں گی، بعض آگے کسی سطح پہ ایک ہو جائیں گی، اور بعض کو باہمی تصادم تراش خراش سے گزار کر کسی ایک قوت کو ابھار دے گا۔ ایسی کوششوں کے نتیجے میں ملت میں نظم پیدا ہو سکتا ہے۔ ورنہ فرد فرد کو بھیڑ بکریوں کی طرح رہنے دیجیے، کوئی گڈریا منہ میں بانسری لیے اور کندھے پہ لاٹھی رکھے انہیں جدھر چاہے گا ہانکتا رہے گا۔

یہ بھی واضح رہے کہ یہ بھی سیاسی پارٹیاں ہیں جو اپنے گرد جمع ہونے والوں کی سیاسی تربیت کرتی ہیں، مسائل کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہیں، رائے دہی کے قابل بناتی ہیں، دستور اور پارلیمانی قواعد سمجھاتی ہیں، مشاورت باہمی کے طور طریقوں کی عملی تعلیم دیتی ہیں۔ ڈسپلن میں رہ کر کام کرنے کی خصوصیت پیدا کرتی ہیں۔ یہ اہتمام اگر نہ ہو تو پھر کون سی یونیورسٹی یا کالج یا انسٹی ٹیوٹ آپ کے پاس ایسا ہے جو کروڑوں کی آبادی کو یہ تربیت دے سکے۔

۶ ــــ جس دین میں جماعت بندی کی تعلیم یہ رہی ہو کہ اگر دو مسافر ہوں تو ایک امیر کارواں ہوگا اگر دو نمازی ہوں تو ایک امام ہوگا، حج کے لیے نکلو تو ایک امیر حج ہوگا، گھر کی زندگی ہو تو ایک قوام ہوگا، اس کے متعلق یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ لوگ گروہ در گروہ ووٹ دینے نکلیں اور کوئی اُن کا سربراہ نہ ہو۔ یا کچھ لوگ امیدوار بن کے اُٹھیں اور کوئی ان کا ذمہ دار نہ ہو، یا کچھ لوگ پارلیمانی ایوانوں کی کارروائی میں حصہ لیں اور کوئی اُن کا انسٹرکٹر نہ ہو۔ کسی مسلمان کے لیے ایسی غیر جماعتی زندگی کسی بھی دائرے میں قابلِ قبول نہیں۔

فوج منظم، کیبنٹ منظم، انصاری کمیشن منظم، ادارۂ تحقیقات اسلامی منظم، عدالتیں منظم، بیوروکریسی دفتر در دفتر منظم، لے دے کے ایک سیاسی نظم بندی شریعت کی زد میں آتی ہے؟ پھر سوچیے۔

ہمارے خیال میں عین شرعی تقاضوں کے تحت افراد کو سیاست یا انتخابات میں لینے کے لیے منظم ہونا چاہیے ــــ معیاری صورت یہ کہ سارے پاکستان میں تمام آبادی کو

ایک ہی جماعت ہیں، اور یہ حاصل نہ ہو تو کم سے کم مختلف صحیح المقاصد قیادتوں کے تحت۔

ایک اہم مسئلہ متناسب نمائندگی کا ہے[1]۔

یہ طریق انتخاب نہ صرف یہ کہ یورپ کی متعدد ریاستوں میں رائج ہے، بلکہ اب تو برطانیہ کی انتخابی سیاست بھی اسی رُخ جا رہی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ طریقہ سخت غیر منصفانہ اور خود رُوحِ جمہوریت کے خلاف ہے۔ مثلاً ۴ اُمیدواروں میں سے ایک ۱۰٪ ووٹ لیتا ہے، دوسرا ۲۰٪، تیسرا ۳۰٪، چوتھا ۴۰٪۔ اب ۴۰ فیصد ووٹ لینے والا کامیاب قرار پایا اور ۶۰ فیصد ووٹ جو دراصل اُس کامیاب شخص کے خلاف پڑے ہیں وہ بالکل بے معنی قرار پاتے ہیں بلکہ اور کئی صورتیں ہیں جن میں ۲۷ فیصد ووٹ لینے والا اُمیدوار ۷۳ فیصد مخالف ووٹروں کے علی الرغم بازی مار لے جاتا ہے۔

علاوہ ازیں اس طریقِ انتخاب کی اور کئی خوبیاں ہیں:

۱۔ حلقۂ انتخاب پورا ملک ہو، صوبہ ہو، کمشنری ہو یا ضلع، کسی خیال کے ووٹر کا ووٹ ضائع نہیں جاتا۔ جس تناسب سے ووٹ مختلف جماعتوں کو ملیں گے، اُسی تناسب سے ان کی پیش کردہ لسٹوں میں سے نمائندے لے لیے جائیں گے۔ اس طریقے میں کوئی امکان نہیں کہ ملک بھر میں مجموعی طور پر ۳۵٪ یا ۲۷٪ ووٹ لے کر کوئی جماعت اقتدار کی کرسی پر جا بیٹھے۔

۲۔ ووٹروں کی اصل توجہ جماعتوں کے اُصولوں، مقاصد اور اُن کے منشوروں پر مرتکز

---

[1] متناسب نمائندگی کی مختلف تفصیلی اشکال سے قطع نظر خلاصہ یہ ہے کہ ہر باضابطہ جماعت یا پارٹی ملک یا صوبے یا ضلعے (جو بھی حلقۂ انتخاب ہو) کی مقررہ سیٹوں کے لیے اتنے ہی (یا کم) نمائندوں کی فہرست پہلے سے داخل کر دیتی ہے۔ پھر کل حلقۂ انتخاب میں جتنے ووٹ کسی پارٹی کو ملتے ہیں ان کے تناسب سے اس کی لسٹ میں سے افراد لے لیے جاتے ہیں۔ اس طرح ووٹ ضائع نہیں جاتے اور نہ اقلیتی ووٹوں کے بل پر کوئی فرد یا جماعت انتخاب سر کر سکتی ہے۔

ہوتی ہے، افراد کی لسٹ کو ثانوی طور پر دیکھا جاتا ہے کہ کس میں کتنی اور کیا قابلیتیں ہیں۔ اسی طرح جمہور کی نگاہ چھوٹے چھوٹے ذاتی یا مقامی یا علاقائی مفاد سے اونچی اٹھ کر بڑے بڑے ملکی مفاد پر مرتکز ہونے لگتی ہے۔

۳۔ برادری پرستوں، علاقہ پرستوں اور نسل پرستوں کے خودساختہ طلسم ٹوٹ جاتے ہیں۔

۴۔ امیدوار افراد اپنی اپنی ذاتی کامیابی کے لیے محدود حلقۂ انتخاب میں جس طرح روپیہ دے کر ضمیر خریدتے، ڈراتے دھمکاتے، فساد کراتے اور طرح طرح کی بدعنوانیاں ایجاد کرتے ہیں۔ اور سارے معاشرے میں مستقل طور پر کرپشن پھیلا دیتے ہیں۔ یہ سارا سلسلہ متناسب نمائندگی کی شکل میں باقی نہیں رہتا۔ منتفرق افراد کے بجائے سارا عمل منظم جماعتوں کے ذریعے مکمل ہوتا ہے۔

۵۔ سارے ملک یا جتنا بھی حلقۂ انتخاب مقرر کیا جائے، اس کے لیے فہرستیں پیش کر کے مقابلے میں آنے والی جماعتوں کے حساب سے ووٹ کارڈ میں چند نشانات مقرر کرنے ہوں گے یعنی کام میں بہت سادگی اور آسانی پیدا ہو جائے گی۔ بلکہ ملک بھر میں ایک پارٹی کے لیے ایک رنگ یا نشان مقرر ہو جانا چاہیے۔

۶۔ جماعتوں کی پیش کردہ لسٹوں کی جانچ پڑتال یک جائی ہو سکتی ہے، اور خاص خاص مقررہ شرائط اور پابندیوں کے معیار پر ان کو پرکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اصل ذمہ داری پارٹیوں کی ہو گی، ان کو پہلے سے لازمی اصول و معیار برائے نمائندگان دے دیئے جائیں گے کہ وہ ان کے مطابق لسٹ میں نمائندے شامل کریں اور جب بھی کسی کامیاب رکن کے خلاف کوئی صورتِ واقعہ سامنے آ جائے گی۔ جس کی گنجائش قانون انتخابات میں نہ ہو تو اسے الگ کر کے اس کی جگہ لسٹ میں بعد کے کسی نمبر کے آدمی کو لے لیا جائے گا۔ اور الگ ہونے والے شخص کے خلاف پارلیمانی یا عدالتی کسی بھی قسم کی کارروائی الگ ہوتی رہے گی۔

یعنی اس طریقِ کار میں ضمنی انتخابات کے مصارف و انتظامات سے حکومت بری الذمہ ہو جائے گی۔

۷۔ سرمایہ دار، صنعت کار اور وڈیرے یقیناً جماعتوں کے اندر بھی گھسیں گے اور

اپنے آدمیوں کو بھی روپے کے زور سے لسٹوں میں شامل کرانے کی کوشش کریں گے، مگر ان لوگوں کے لیے فرداً فرداً خاص ہتھکنڈوں سے انتخابی جنگ لڑنے کا راستہ بند ہو جائے گا۔ بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ پارٹیوں کو اہمیت ملنے کے بعد اُن کی قوت و اثر میں کمی آجائے گی اور آہستہ آہستہ منفرق افراد کے آگے آنے کا سلسلہ بند ہو جائے گا۔

اس طریق انتخاب پر دو ہی اعتراض کیے جاتے ہیں:۔

(الف) ایک یہ کہ اس طرح ایک کولیشن حکومت تو بن سکتی ہے مگر کسی ایک پارٹی کی اکثریت نہیں ہو سکتی ہے۔ یہ صحیح ہے، مگر سوائے دھاندلی کے اور کسی بھی طرح موجودہ ماحول میں کوئی ایک پارٹی اکثریت نہیں حاصل کر سکتی۔ عام طریق انتخاب کے تحت بھی اہم پارٹیاں مل کر حکومت بنائیں گی۔ یا اُن کا کوئی متحدہ محاذ کامیاب ہو کر نظام کو چلائے گا۔ اور اس وقت کے بحرانی حالات کی پیچیدگیاں ہیں بھی ایسی کہ ضرورت ایک متحدہ مخلوط حکومت ہی کی ہے تاکہ ساری قوتیں مل کر ناسازگاری احوال کا مقابلہ کریں۔ آگے چل کے ایسا موقع بھی آسکتا ہے کہ کسی ایک پارٹی کو ملک بھر میں اکثریتی ووٹ حاصل ہو جائیں۔

ب۔ دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ متناسب نمائندگی کی صورت میں آزاد نمائندوں کے لیے کام کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ حالانکہ بسا اوقات وہ پارٹیوں کے پابند افراد سے زیادہ بہتر کام کر دکھاتے ہیں۔ اس کا اولین جواب تو یہ ہے کہ آج تک کہ تاریخ تو اس کی گواہ ہے کہ آزاد حضرات ایوان میں جاکر بہترین بکاؤ مال ہوتے ہیں یا بہتر خریدار کہ جدھر ان کا سودا ٹھیک بیٹھ جائے، وہ اُدھر کے ہو جاتے ہیں۔ بہت سے آزاد امیدوار کچھ دوسرے حلقوں کے ساتھیوں کے ساتھ مل کر پروگرام بناتے ہیں اور پھر اپنی چند نفری متحدہ قوت کو روپے کی تقسیم اور مفاد رسانی کے حربے سے کئی افراد کو اِدھر اُدھر سے توڑتے اور بسا اوقات وزارتوں تک مار کرتے ہیں۔ قوم کے لیے بہتر یہ ہے کہ اس پارلیمانی کرپشن سے اُسے نجات مل جائے جس کا بہترین طریقہ متناسب نمائندگی کا طریقہ ہے۔ ہاں آزاد حضرات یہ کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ایک پارٹی میں ڈھالیں اور اس کا کوئی ضابطہ و منشور بنائیں، اس کی مناسب حد تک ممبرشپ ہو اور اس میں انتخابی عمل کام کرے۔ وہ رجسٹریشن حاصل

کریں ۔ وہ اپنی جماعت کو "آزاد نمائندوں کی جماعت یا گروپ" ہی قرار دے لیں۔
پس یہ دو اعتراضات ایسے نہیں جن کی وجہ سے تناسب نمائندگی کی خوبیاں بے معنی ہو جائیں۔

سُننے میں نت نئی باتیں آتی ہیں اور کسی کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی ثقاہت کیسی ہے۔ مثلاً ایک یہ افواہ اوپر سے آئی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ تناسب نمائندگی کا تجربہ ہر ضلعے کو ایک حلقۂ انتخاب بنا کر کیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ پہلے قدم اور تجربے کے طور پر یہ صورت بھی اچھی ہے۔ تاہم بعض ضلعوں یا ضلعوں کے خاص خاص بڑے بڑے علاقوں (اور مزارعوں) پر بعض لوگوں کے خصوصی اثرات ایسے ہیں کہ اُن کو کام میں لا کر ضلع کی مختصر سی فہرست میں جگہ پا کر بآسانی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ حالانکہ اس طرح کے صتیاد ان مناصب کے اثر و نفوذ کو بالواسطہ طور پر ختم کرنا ایک مقصد ہونا چاہیے۔ بعض جماعتیں جن کا دار مدار اس طرح کی علاقائی با اثر شخصیتوں (خصوصاً زمینداروں، صنعت کاروں اور وڈیروں) پر ہوتا ہے وہ بھی اغلباً ضلع کی سطح کو پسند کر لیں۔ ضلع کی حد تک ووٹوں کی بڑی بڑی چند منڈیوں کے سیٹھوں کو خریدنا مشکل نہیں ہوتا اور خاندانوں یا برادریوں (PRESSURE GROUPS) کی قوت کو بھی حرکت میں لایا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر ترجیحاً ملک اور ثانوی حد تک صوبہ اگر حلقۂ انتخاب بنے تو پھر بعض با اثر اور دولت کے لالچ اور جرائم و تشدد کی تخریب سے کام لینے والے اصحاب بہت زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

پھر بھی ایک درمیانی صورت ہے کہ کمشنری کو بنیادی حلقہ قرار دیا جائے۔ مقصود نہ صرف حالیہ یا آئندہ کے انتخابات کی آسانیاں ہوں، بلکہ آہستہ آہستہ کمشنری کو زیادہ سے زیادہ قوت و اختیار کا مرکز بنایا جائے۔ صوبوں کے نظام کو مختصر شکل دے کر عارضی طور پر محض نگرانی اور ہم آہنگی کے لیے برقرار رکھا جائے۔ اس طرح ایک تو "پنجاب" کے خلاف جو شکایات اُٹھائی جاتی رہتی ہیں ان کا ازالہ کرنا ممکن ہے۔ چھوٹے بڑے سارے صوبوں میں معاملات کمشنری کی سطح پر آجائیں گے اور بے شمار لیڈرز اور کارکنوں کو بہت قریب دائرہ ہائے کار مل جائیں گے

بلکہ عوام کے زیادہ سے زیادہ مسائل کا حل اس سطح پر چلا جائے گا۔

پاکستان میں لیڈری کا حصول ہے بھی مشکل۔ پھر اس کی ضرورت بھی محدود ہو جائے گی اور ملکی یا وفاقی سطح پر لیڈری کی حیثیت حاصل کرنے والے خاص خاص اہل افراد ہی آگے آئیں گے۔ یہ ممکن نہ رہے گا کہ دس دس، پچاس پچاس افراد کو ساتھ لے کر کچھ سیاسی اکابر ایک پارٹی کی حیثیت سے میدان میں آجائیں۔ پارٹی کے لیے ملک گیر ہونا لازمی ہوگا۔ اور انتخابات کے انعقاد سے ایک خاص مقررہ مدت پہلے سے اس کا وجود اچھی طرح متعارف ہونا چاہیے۔

متناسب نمائندگی کے ساتھ سیاست اور لیڈری کو کمشنری کے دائرے میں لے جانے سے ہماری وہ بہت سی الجھنیں حل ہو سکتی ہیں جو آج کی سیاست میں موجود ہے اور بالکل ابتدا سے نشوونما پاتی رہی ہیں۔ علیحدگی پسندی کے رجحانات کے لیے بھی فضا ناسازگار ہو جائے گی۔

یہ ایسے مسائل میں سے ایک ہے جسے ہمارے مخلص مدبّرین (اگر وہ اُوپر پائے جاتے ہوں) کو سر جوڑ کر پوری دماغ سوزی کے ساتھ سوچنا چاہیے۔ پاکستان کے تصور کے بعد شاید یہ اہم ترین تخیل ہے جو ہمارے ملکی اور علاقائی دروبست کو بہتر شکل دے سکتا ہے۔

جلد انتخابات —— جماعتی انتخابات —— جداگانہ انتخابات —— متناسب نمائندگی کے اُصول پر انتخابات!

مُلک و ملّت کے لیے یہ بہترین راستہ ہے۔

ہماری چند نئی مطبوعات

النبی الامیؐ
شہید آیت اللہ مرتضیٰ مطہری

سیرت النبیؐ کے موضوع پر ایک عالمانہ تصنیف

قیمت: -/15 روپے

ہم کیوں مسلمان ہوئے؟
پروفیسر عبدالغنی فاروق

ماضی قریب کے ۶۶ نامور نو مسلم حضرات کی روح پرور سرگزشت

قیمت: -/48 روپے

اسلام کا نظام عشر و زکوٰۃ
سید اسعد گیلانی ایم اے

اسلامی معیشت کے اہم اور بنیادی موضوع پر ایک جامع کتاب

قیمت: -/35 روپے

تاریخ تصوف
علامہ محمد اقبالؒ

- شاعر مشرق علامہ محمد اقبالؒ کی ایک نایاب تصنیف
- ۱۹۸۵ء کی اہم دریافت

قیمت: 25/50 روپے

روس کے مسلمان
ثروت صولت

تاریخ کے آئینہ میں

- روس کے مسلمانوں کی روح فرسا داستان
- جس کو مصنف نے ماضی کے جھروکوں میں جھانک کر ملت اسلامیہ کی تاریخ کے نہایت دقیع باب کو دوبارہ دانشگاف کیا ہے۔

قیمت: -/39 روپے

حضور سرکار دو عالمؐ
فاران کی چوٹیوں سے مشعلِ آفتاب طلوع ہوئے اور اپنی نورانی کرنوں سے کفر و شرک کی وادیوں کو بقعہ نور بنا دیا۔ اس آفتاب سے کئی ماہتاب اور ستارے جگمگائے اور پھر چراغ سے چراغ جلتے رہے سرزمین عرب جسکا گوشہ گوشہ اسلام کی حقانیت سے معمور اور جسکا ذرہ ذرہ ہر فرزند توحید کے دل کا سرور اور آنکھوں کا نور ہے انہی روشن داستانوں کے سلسلہ میں

جناب ابن عبدالشکور نے صحابہ کرام کی سیرت کے سلسلہ میں خوبصورت کتب تحریر کی ہیں جو نہایت دل نشین اور تحریکی انداز میں لکھی گئی ہیں۔

- سیرت حضرت زید بن حارثہؓ — قیمت: -/9 روپے
- سیرت حضرت سلمان فارسیؓ — قیمت: -/9 روپے
- سیرت حضرت عمارؓ بن یاسر — قیمت: -/9 روپے
- سیرت حضرت بلال حبشیؓ — قیمت: -/9 روپے
- سیرت حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف — قیمت: 6/75 روپے
- سیرت سیدہ زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ — قیمت: 6/75 روپے

زیر طبع کتب
- سیرت حضرت خدیجہؓ طاہرہ
- سیرت حضرت زبیرؓ بن العوام
- سیرت حضرت ابو ایوبؓ انصاری
- سیرت حضرت فاطمہؓ
- سیرت حضرت طلحہ بن عبداللہ

مکتبہ تعمیر انسانیت۔ اردو بازار۔ لاہور ۲۔ فون: ۳۱۰۵۴۳

تبدیلیٔ پتہ

اِدارۂ ترجمان القرآن لمیٹڈ

دربار مارکیٹ (میلا رام ملز)

سے

رحمٰن مارکیٹ ، غزنی سٹریٹ ، اُردو بازار

منتقل ہوگیا ھے۔ قارئین نوٹ فرمالیں

جنرل مینجر

اِدارۂ ترجمان القرآن لمیٹڈ۔ لاھور